سود پر تاریخی فیصلہ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

ترجمہ

ڈاکٹر مولانا محمد عمران اشرف عثمانی

سُود
پر
تاریخی
فیصلہ

سود پر تاریخی فیصلہ

از

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

سابق جج شریعت اپیلٹ بنچ سپریم کورٹ آف پاکستان

مترجمہ

ڈاکٹر مولانا محمد عمران اشرف عثمانی صاحب

(پی ایچ ڈی)

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ،

وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ، اما بعد:

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئینی ڈھانچے کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ ہر پاکستانی کو یہ آئینی حق حاصل ہے کہ وہ موجودہ کسی قانون کو وفاقی شرعی عدالت میں اس وجہ سے چیلنج کرسکتا ہے کہ یہ قانون قرآن وسنت پر مبنی اسلامی اَحکامات کے خلاف ہے۔ اس قسم کی درخواست وصول کرنے کے بعد وفاقی شرعی عدالت، حکومتِ پاکستان کو ایک نوٹس جاری کرتی ہے کہ وہ اس بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرے، اگر متعلقہ فریقین کی سماعت کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچے کہ زیرِ دعویٰ قانون واقعتاً اسلام کے خلاف ہے تو وہ ایک فیصلہ صادر کرتی ہے کہ ایک متعین مدّت تک حکومت ایسا قانون لے کر آئے گی جو کہ اسلامی اَحکامات کے مطابق ہوگا، اور وہ قانون جسے اسلامی اَحکام کے منافی قرار دیا گیا تھا اس مدّت کے بعد غیر مؤثر ہوجائے گا۔

وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ سپریم کورٹ آف پاکستان کی شریعت اپیلٹ بنچ میں چیلنج کیا جاسکتا ہے جس میں اس فیصلے سے متأثر کوئی بھی شخص یا فریق اپیل

دائر کرسکتا ہے، اور پھر سپریم کورٹ کی اس بنچ کا فیصلہ حتمی تصوّر ہوتا ہے۔

وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ آف پاکستان کی شریعت اپیلٹ بنچ سنہ ۱۹۷۹ء کے آئینِ پاکستان کے چیپٹر 3-A کے تحت وجود میں آئی تھیں، لیکن ابتداء میں کچھ قوانین کو ان کی جانچ پڑتال سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا، جس کے نتیجے میں ان پر غور وخوض ان عدالتوں کے دائرۂ اختیار سے باہر تھا۔

چنانچہ مالیاتی قوانین بھی دس سال تک کے لئے ان عدالتوں میں سماعت سے محفوظ تھے، اس مدّت کے ختم ہونے کے بعد بہت سی درخواستیں وفاقی شرعی عدالت میں دائر کی گئیں تاکہ ان قوانین کو چیلنج کیا جاسکے جو سود کو جائز قرار دیتے ہیں۔ وفاقی عدالت نے ان درخواستوں کی سماعت کے بعد سنہ ۱۹۹۱ء میں یہ فیصلہ صادر کیا کہ ایسے قوانین، اسلامی اَحکامات کے خلاف ہیں۔ وفاقی حکومت پاکستان اور ملک کے مختلف بینک اور تمویلی اداروں نے وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ کی شریعت اپیلٹ بنچ میں دعویٰ دائر کردیا، سپریم کورٹ کی شریعت اپیلٹ بنچ میں محترم جسٹس خلیل الرحمٰن خان صاحب، محترم جسٹس منیر اے شیخ صاحب، محترم جسٹس وجیہ الدین احمد صاحب اور جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب شامل تھے۔ اس بنچ نے ان اپیلوں کی سماعت مارچ ۱۹۹۹ء میں شروع کی، اس بنچ نے بیس علمائے کرام اور ملکی و غیرملکی محققین کو دعوت دی، کہ وہ اس اہم مسئلے پر عدالت کی معاونت کریں۔ یہ ماہرین جنھوں نے آکر عدالت سے خطاب کیا، ان میں علمائے کرام، بینکار، قانون دان، معیشت دان، تاجر حضرات اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ وغیرہ بھی شامل تھے۔ اس مقدمے کی سماعت جولائی سنہ ۱۹۹۹ء کے آخر تک جاری رہی، جس کے بعد فیصلہ محفوظ کرلیا گیا۔

۲۳ردسمبر سنہ ۱۹۹۹ء کو اس نئی صدی سے صرف آٹھ دن پہلے سپریم

کورٹ آف پاکستان کی شریعت اپیلٹ بنچ نے اپنا یہ تاریخ ساز عظیم فیصلہ سنایا جس میں سود کو غیر قانونی اور اسلامی اَحکامات کے منافی قرار دیا اور اس کے تحت ۳۱؍مارچ سنہ ۲۰۰۰ء، اور کچھ قوانین کو ۳۱؍جولائی ۲۰۰۰ء، اور باقی دُوسرے قوانین کو ۳۰؍جون ۲۰۰۱ء سے منسوخ اور غیر مؤثر قرار دے دیا گیا، اس بنچ نے وفاقی حکومت کو یہ بھی ہدایت کی کہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیشن قائم کیا جائے جو موجودہ سود پر مبنی مالیاتی نظام کو اسلامی نظام پر منتقلی کی نگرانی اور کنٹرول کرنے اور مکمل طور پر اپنے اختیارات سے متعلقہ اُمور سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس فیصلے نے کافی جامع ہدایات جاری کیں تاکہ اس متعین ٹائم فریم میں یہ عملِ انتقال مکمل ہوسکے۔

سپریم کورٹ کا مکمل فیصلہ تقریباً ۱۱۰۰ صفحات پر محیط ہے، اور یہ بات ایک حقیقتِ مُسلّمہ ہے کہ یہ سپریم کورٹ کا اس ملک کی تاریخ میں ضخیم ترین فیصلہ ہے، یہ مرکزی فیصلے محترم جسٹس خلیل الرحمٰن خان صاحب (تقریباً ۵۰۰ صفحات) اور جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے (تقریباً ۲۵۰ صفحات) ہیں، جبکہ محترم جسٹس وجیہ الدین احمد صاحب نے ۹۸ صفحات پر مشتمل ایک تائیدی نوٹ کے ساتھ لکھا ہے۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے کو میڈیا (Media) نے ایک تاریخ ساز فیصلہ قرار دیا اور اسے پورے ملک اور مسلم دُنیا نے خوش آمدید کہا، مگر بعد میں ایک بینک کی درخواست پر سپریم کورٹ کی شریعت بنچ میں (جو جسٹس منیر احمد شیخ صاحب کے سوا باقی تمام نئے ججوں پر مشتمل تھی) فیصلے پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے کیس دوبارہ فیڈرل شریعت کورٹ کے پاس بھیج دیا، تاہم اس فیصلے میں جو علمی بحث ہے اس کی اہمیت اس واقعے سے کم نہیں ہوتی۔

ہمیں یہ اعزاز ہے کہ ہم محترم جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا یہ فیصلہ طبع کر رہے ہیں، کیونکہ اس نے ان تمام اُمور کو جو مقدمے کی سماعت کے دوران اُٹھائے گئے تھے، بہترین طریقے سے مختصر کر کے بیان کردیا ہے۔ ہم نے قارئین کے استفادہ کے لئے اس فیصلے کے بعد کورٹ آرڈر کو بھی شامل کردیا ہے۔

یہ اگرچہ مکمل فیصلے کا ایک حصہ ہے، لیکن اُمید ہے کہ یہ قارئین کے لئے ان بنیادی عوامل اور وجوہات کو سمجھنے میں معاون ہوگا جو اس بنچ کے لئے اس تاریخ ساز فیصلے کا سبب بنیں۔

(مفتی) محمد رفیع عثمانی

جامعہ دارالعلوم کراچی

فہرستِ مضامین

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر

❋❋❋

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعٰفًا مُّضٰعَفَةً

(آل عمران: ۱۳۰)

اے ایمان والو!

سُود مت کھاؤ دُگنا چوگنا کر کے۔

سُود پر تاریخی فیصلہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ وَعَلَیۡہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ

جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی

۱:- یہ تمام اپیلیں وفاقی شرعی عدالت کے ۱۴-۱۱-۱۹۹۱ کے ایک فیصلے کے خلاف ہیں، جس میں اس کورٹ نے بہت سارے ایسے قوانین کو اسلام کے اُصولوں سے متصادم قرار دیا ہے جو انٹرسٹ کی ادائیگی یا وصولی سے متعلق ہیں، جو فیڈرل شریعت کورٹ کی تحقیق کے مطابق اُس رِبا کے دائرے میں آتے ہیں جسے قرآنِ کریم نے صراحتاً حرام قرار دیا ہے۔

۲:- ان تمام اپیلوں میں چونکہ بنیادی مسائل آپس میں ملتے جلتے تھے، لہٰذا ان تمام کو اکٹھے ہی سنا گیا اور اس ایک فیصلے ذریعہ ہی سب کو نمٹایا جارہا ہے۔

۳:- بہت سارے اپیل کنندگان اور عدالتی مشیروں نے ہمارے سامنے یہ دلیل دی کہ سود پر مبنی تجارتی معاملات جدید تجارت کی ایجاد ہیں، جس کی تاریخ چار سو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے، لہٰذا یہ معاملات قرآنِ کریم کی استعمال کردہ اصطلاح ''رِبا'' کے دائرے میں نہیں آتے، چنانچہ رِبا کی حرمت، عہدِ جدید کے مروّجہ انٹرسٹ کے معاملات پر صادق نہیں آتی۔

۴:- اس نقطۂ نظر کی حمایت میں ہمارے سامنے پانچ مختلف خطوط پر انٹرست کی ممانعت کے خلاف دلائل پیش کیے گئے۔

۵:- پہلی دلیل اصطلاحِ ''رِبا'' کی تشریح کرتے ہوئے بعض اپیل کنندگان کی جانب سے یہ دی گئی کہ رِبا کی حرمت والی قرآنی آیات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے آخرِ دورِ حیات میں نازل ہوئی تھیں، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی تفصیلی تشریح کا موقع نہ مل سکا، اس وجہ سے رِبا کی کوئی جامع مانع تعریف نہ قرآنِ کریم میں اور نہ احادیث میں دستیاب ہے، چونکہ اصطلاحِ ''رِبا'' اپنی اصل کے لحاظ سے مبہم ہے، لہٰذا یہ متشابہات کی حدود میں داخل ہے، جس کے صحیح معنیٰ نامعلوم ہیں۔ اس دلیل کی رُو سے رِبا کی ممانعت احادیث کے صراحتاً بیان کردہ صرف چند متعین معاملات تک محدود ہے، لہٰذا اس اُصول کو پھیلا کر عصرِ حاضر کے بینکاری نظام پر لاگو نہیں کیا جاسکتا، جو اِن آیات کے نزول کے زمانے میں تصور کے قابل تک نہ تھا۔

۶:- ان حضرات کی دُوسری دلیل ان خطوط پر ہے کہ رِبا کا لفظ صرف ان صَرفی (احتیاجی) قرضوں پر لاگو ہوتا ہے جس میں قرض خواہ (Creditor) اپنے مقروض سے حد سے بڑھی ہوئی شرحِ سود کے حساب سے سود وصول کرتا تھا، اور یہ شرحِ سود استحصال پر مشتمل ہوتی تھی۔ جہاں تک موجودہ بینکنگ کے سود کا تعلق ہے، اگر اس میں شرحِ سود حد سے زیادہ یا استحصال پر مشتمل نہ ہو تو اسے ''رِبا'' نہیں کہا جاسکتا۔

۷:- تیسری دلیل صَرفی قرضوں اور تجارتی قرضوں کے درمیان امتیاز کرتی ہے، اس دلیل کے مطابق قرآنِ کریم کی استعمال کردہ اصطلاح ''الربا'' صرف اس اضافی رقم تک محدود ہے جو اُن غریب لوگوں سے وصول کی جاتی تھی جو اپنی روزمرّہ ضروریات کی تکمیل کے لئے قرضے لیا کرتے تھے، یہ غریب لوگ انسانی بنیادوں پر ہمدردانہ سلوک کے مستحق تھے، لیکن مال دار لوگوں نے اپنی حریصانہ شرائط عائد کرکے ان سے بھاری بھاری سود (Usury) کی رقمیں وصول کرکے ناجائز نفع اندوزی اور استحصال سے کام لیا، قرآنِ کریم نے اس عمل کو انسانیت کے خلاف عظیم جرم قرار دے کر ان لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ جہاں تک جدید زمانے کے تجارتی قرضوں کا تعلق ہے، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رائج نہ تھے، یہاں تک کہ رِبا کی حرمت کا بنیادی فلسفہ بھی ان تجارتی اور پیداواری (Productive) قرضوں

پر لاگو نہیں ہوتا جہاں مقروض غریب نہیں ہوتے، بلکہ اکثر حالات میں یا تو وہ امیر لوگ ہوتے ہیں یا کم از کم خوشحال ہوتے ہیں، اور ان کا حاصل کردہ قرضہ عموماً نفع اندوزی کے لئے ہی استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے قرض خواہوں کی طرف سے عائد کردہ کوئی بھی اضافہ ظلم قرار نہیں دیا جاسکتا جو کہ ربا کی حرمت کا بنیادی سبب تھا۔

۸:- چوتھی دلیل دیتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ قرآنِ کریم نے صرف "ربا الجاھلیة" کو حرام قرار دیا ہے، جو بہت ساری روایات کی رُو سے ایک مخصوص قرضے کا معاملہ تھا، جس میں کوئی اضافی رقم اصل رأس المال (سرمایہ) پر مقرّر نہیں کی جاتی تھی، تاہم اگر مقروض وقتِ مقررہ پر قرضہ ادا نہ کرسکتا تو قرض خواہ اس پر اضافی رقم عائد کرتے ہوئے اسے مزید مہلت دے دیتا تھا، اس نظریہ کی رُو سے اگر کوئی اضافی رقم ابتدائے عقد میں طے کرلی جائے تو یہ معاملہ "ربا القرآن" (یا "ربا الجاہلیہ") کے تحت نہیں آتا، البتہ یہ احادیث کی رُو سے حرام کردہ "ربا الفضل" کے زمرے میں آتا ہے جس کی حرمت کم درجے کی ہے، جسے مکروہ تو کہا جاسکتا ہے، حرام نہیں کہا جاسکتا، اسی لئے اس کی ممانعت کو حقیقی ضرورت کے وقت مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے، اور یہ ممانعت غیر مسلموں پر لاگو نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ ایک ایسا خصوصی قانون ہے جو کہ صرف مسلمانوں پر اطلاق پذیر ہوگا، لہٰذا یہ مسلم پرسنل لاء کے زمرے (Catagory) میں آئے گا، جو کہ فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے، جیسا کہ آئینِ پاکستان کی شق ۲۰۳ ب میں بیان کیا گیا ہے۔

۹:- پانچویں دلیل کا انداز یہ تھا کہ انٹرسٹ پر مبنی معاملات اگرچہ ربا کی حرمت کے دائرے میں داخل ہیں، تاہم تجارتی انٹرسٹ (سود) چونکہ موجودہ زمانے کی عالمی اقتصادی سرگرمیوں میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے کوئی ملک سود پر مبنی معاملات میں ملوّث ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، لہٰذا انٹرسٹ (سود) کو اندرونی اور بیرونی معاملات سے بالکلیہ ختم کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا، اسلام چونکہ ایک عملی

(Practical) مذہب ہے، اس لئے نظریۂ ضرورت کو تسلیم کرتا ہے، چنانچہ وہ شدید حالات میں جب کوئی شخص خنزیر کھائے بغیر زندہ نہ رہ سکے، خنزیر تک کھانے کی بھی اجازت دے دیتا ہے، یہی نظریۂ ضرورت ان سودی معاملات پر لاگو ہونا چاہئے، لہٰذا نظریۂ ضرورت کے تحت وہ قوانین جو کہ سود وصول کرنے کی اجازت دیتے ہیں، انہیں اسلام کے اُصول سے متصادم قرار نہیں دینا چاہئے۔

۱۰:- ان مختلف قسم کے دلائل نے ہمیں اس بنیادی مسئلے کو طے کرنے پر مجبور کیا کہ آیا موجودہ تمویلی نظام کا تجارتی سود قرآنِ کریم کے حرام کردہ ''رِبا'' کی تعریف میں آتا بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر وہ ''رِبا'' کی تعریف میں آتا ہے تو اس کے نتیجے میں کیا اس تجارتی سود کو نظریۂ ضرورت کی بنیاد پر حلال قرار دیا جاسکتا ہے؟ ہمیں اس بات کا جائزہ بھی لینا پڑا کہ آیا جدید تمویلی (Financial) معاملات انٹرسٹ کے بغیر بھی ڈیزائن کئے جاسکتے ہیں؟ اور کیا مجوزہ متبادل طریقے عہدِ حاضر کے تجارتی (Commercial) اور تمویلی (Financial) ڈھانچے کو مدِنظر رکھتے ہوئے ممکن (Feasible) بھی ہیں یا نہیں؟ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے ہم نے کافی تعداد میں عدالتی مشیر کی حیثیت میں ماہرین کو مدعو کیا، جن میں شریعہ اسکالرز (علمائے کرام)، اقتصادی ماہرین، بینکرز، اکاؤنٹینٹس اور جدید تجارت کے ماہرین شامل ہیں، جنہوں نے اپنے پیشہ ورانہ اختصاص اور مہارت کے میدان میں عدالت کی معاونت کی۔

حرمتِ رِبا سے متعلق قرآنی آیات کا معروضی مطالعہ

۱۱:- مذکورہ بالا دلائل کا تجزیہ کرنے سے پیشتر رِبا سے متعلق آیاتِ قرآنیہ کا معروضی مطالعہ کرنا مناسب ہوگا، یہ چار قسم کی آیات مختلف مواقع پر نازل ہوئیں۔

۱۲:- پہلی آیت سورۂ رُوم کی ہے، جو مکی سورت ہے، جس میں رِبا کی اصطلاح درجِ ذیل الفاظ میں ذکر کی گئی ہے:-

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْ اَمْوٰلِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ. (۳۹:۳۰)

ترجمہ:- اور جو چیز تم اس غرض سے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جاوے تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا۔

۱۳:- دُوسری آیت سورۂ نساء کی ہے، جس میں اصطلاحِ رِبا کو یہودیوں کے اعمالِ بد کے سیاق میں ذکر کیا گیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:-

وَاَخْذِھِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُھُوْا عَنْہُ. (۱۶۱:۴)

ترجمہ:- نیز ان (یہودیوں) کی یہ بات کہ سود لینے لگے، حالانکہ اس سے روک دیئے گئے تھے۔

۱۴:- تیسری آیت سورۂ آلِ عمران میں ہے، اور اس میں رِبا کی حرمت مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کی گئی ہے:-

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً.

(۱۳۰:۳)

ترجمہ:- اے ایمان والو! رِبا مت کھاؤ دُگنا چوگنا کر کے۔

۱۵:- آیات کا چوتھا مجموعہ سورۃ البقرہ میں درج ذیل الفاظ کے ساتھ مذکور ہے:-

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ، ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا، وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا، فَمَنْ جَآءَہٗ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ فَانْتَھٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ، وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ. یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ. اِنَّ

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ. وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ، وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ، ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ. (۲۷۵ تا ۲۸۱)

ترجمہ:- جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھوکر باؤلا کردیا ہو، اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام، لہٰذا جس شخص کو اس کے رَبّ کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لئے وہ سودخوری سے باز آجائے تو جو کچھ پہلے کھاچکا سو کھاچکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اور جو اس کے بعد بھی اس حرکت کا اعادہ کرے گا، وہ جہنمی ہے، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے، اور (یاد رکھو!) تمام ایسے لوگوں کو جو نصیحتِ الٰہی کے ناسپاس اور نافرمان ہیں، اس کی پسندیدگی حاصل نہیں ہوسکتی۔ مسلمانو! اگر فی الحقیقت تم خدا پر ایمان رکھتے ہو، تو اس سے ڈرو اور جس قدر سود مقروضوں کے ذمہ رہ گیا اسے چھوڑ دو، اگر تم نے ایسا نہ

کیا تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ (کیونکہ ممانعت کے صاف صاف حکم کے بعد اس کی خلاف ورزی کرنا، اللہ اور اس کے رسول کے برخلاف جنگ آزما ہو جانا ہے) اور اس (باغیانہ روش سے) توبہ کرتے ہو تو پھر تمہارے لئے یہ حکم ہے کہ اپنی اصل رقم لے لو، اور سود چھوڑ دو، نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ تمہارے ساتھ ظلم کیا جائے۔ اور اگر ایسا ہو کہ ایک مقروض تنگ دست ہے (اور فوراً قرض ادا نہیں کرسکتا) تو چاہئے کہ اسے فراخی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے، اور اگر تم سمجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے بہتری کی بات تو یہ ہے کہ (ایسے تنگ دست بھائی کو) اس کا قرض بطور خیرات بخش دو۔ اور دیکھو! اس دن کی پُرسش سے ڈرو، جبکہ تم سب اللہ کے حضور لوٹائے جاؤ گے، پھر ایسا ہوگا کہ ہر جان کو اپنے عمل سے جو کچھ کمایا ہے اس کا بدلہ پورا پورا اسے مل جائے گا، یہ نہ ہوگا کہ کسی کی بھی حق تلفی ہو۔

آیاتِ رِبا کا تاریخی تجزیہ

۱۶:- مزید آگے بڑھنے سے پیشتر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کو ان کی تاریخی ترتیب سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سورۂ رُوم

۱۷:- ان آیات میں سب سے پہلی آیت سورۂ رُوم کی ہے، جو کہ باتفاق مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، یہ آیت تحریمی نوعیت کی نہیں ہے، یہ صرف سادگی سے اتنا کہتی ہے کہ ''رِبا'' اللہ کے یہاں نہیں بڑھتا، یعنی کہ اس کا آخرت میں کوئی ثواب نہیں

ہے۔ بہت سے مفسرینِ قرآن کی رائے یہ ہے کہ لفظِ ''رِبا'' اس آیت میں سود، یوژری یا انٹرسٹ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے، ابنِ جریر طبریؒ (متوفی ۳۱۰ھ) جو مشہور ترین مفسرِ قرآن ہیں، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور متعدد تابعین مثلاً سعید بن جبیر، مجاہد، طاؤس، قتادہ، ضحاک اور ابراہیم نخعی (رحمہم اللہ) سے روایت کرتے ہیں کہ اس آیت میں استعمال شدہ لفظ ''رِبا'' کا مطلب ''نیوتا'' ہے، یعنی کسی کو ہدیہ اس غرض سے دینا تاکہ بعد میں وہ اس کو اس سے بڑا ہدیہ دے۔[1] تاہم بعض مفسرینِ قرآن نے اس لفظ کو سود کے معنی میں استعمال کیا ہے، بقول ابنِ جوزیؒ[2] یہ نقطۂ نظر حضرت حسن بصریؒ کی طرف منسوب ہے، اگر اس نقطۂ نظر کے مطابق لفظِ ''رِبا'' کو اس آیت میں سود کے معنی میں لیا جائے جو بظاہر زیادہ مناسب بھی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ دُوسری جگہوں میں لفظِ ''رِبا'' اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، تب بھی اس آیت میں رِبا کی ممانعت کے متعین الفاظ موجود نہیں ہیں، زیادہ سے زیادہ اس نے اس بات پر زور دیا ہے کہ آخرت میں رِبا کا اللہ کی طرف سے کوئی ثواب نہیں ہے، اس لئے یہ آیت رِبا کی حرمت پر مشتمل نہیں ہے، تاہم یہ بات واضح ہے کہ اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رِبا کا عمل اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔

سورۃ النساء

۱۸:- دُوسری آیت سورۃ النساء کی ہے، جس میں یہودیوں کی بداعمالیوں کی فہرست کے ذیل میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ وہ رِبا لیا کرتے تھے، باوجودیکہ وہ ان پر پہلے سے حرام تھا، اس آیت کے نزول کے حقیقی وقت کا تعین فی الواقع مشکل ہے، مفسرینِ کرامؒ اس نکتے پر زیادہ تر خاموش دکھائی دیتے ہیں، تاہم جس سیاق میں یہ

(۱) ابنِ جریر: تفسیر جامع البیان، دارالفکر بیروت ۱۹۸۴ء ج:۲۱ ص:۴۶ تا ۴۸۔

(۲) ابنِ جوزی: زاد المعاد، المکتبۃ الاسلامیہ بیروت ۱۹۶۴ء ج:۶ ص:۳۰۴۔

آیت نازل ہوئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت سنہ ۴ھ سے قبل نازل ہوئی ہوگی، سورۃ النساء کی آیت نمبر۱۵۳ درجِ ذیل ہے:-

یَسْئَلُکَ اَھْلُ الْکِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْھِمْ کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ.

ترجمہ:- آپ سے اہلِ کتاب (یہود) یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کے پاس ایک خاص نوشتہ آسمان سے منگوادیں۔

۱۹:- یہ آیت یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اگلی چار آیات یہودیوں کے دلائل کے جوابات دینے کے لئے نازل کی گئیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے اور آپؐ سے آسمان سے اس طرح کی کتاب نازل کروانے کی درخواست کی تھی، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی۔

اس کا مطلب ہے کہ آیات کا یہ سلسلہ اس وقت نازل ہوا جب یہودی کافی بڑی تعداد میں مدینہ میں موجود تھے، اور اس وقت وہ اس پوزیشن میں بھی تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث کرسکیں، چونکہ اکثر یہودی سنہ ۴ھ کے بعد مدینہ چھوڑ چکے تھے، اس لئے یہ آیت اس سے قبل نازل شدہ معلوم ہوتی ہے، یہاں پر لفظِ ''رِبا'' بلاشبہ سود کے معنیٰ میں ہے، کیونکہ وہ یہودیوں کے لئے واقعۃً ممنوع تھا، یہ ممانعت بائبل کے پرانے صحیفوں میں ابھی تک موجود ہے، لیکن اسے مسلمانوں کے لئے دوٹوک اور واضح ممانعتِ رِبا کا حکم قرار نہیں دیا جاسکتا، یہ آیت صرف اتنی بات واضح کرتی ہے کہ رِبا یہودیوں کے لئے ممنوع تھا، لیکن انہوں نے اپنی عملی زندگیوں میں اس کی تعمیل نہ کی، البتہ اس سے یہ بات ضرور مستنبط ہوتی ہے کہ رِبا مسلمانوں کے لئے بھی یقیناً ایک گناہ کا کام ہے، ورنہ یہودیوں کو موردِ الزام ٹھہرانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

سورۂ آلِ عمران

۲۰:- دُوسری آیت سورۂ آلِ عمران کی ہے، جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ہجرت کے دُوسرے سال نازل کی گئی ہوگی، کیونکہ اگلی اور پچھلی آیات

غزوۂ اُحد ہی سے متعلق ہیں، جو سنہ۳ھ میں پیش آیا۔ یہ آیت مسلمانوں کے لئے حرمتِ رِبا کے سلسلے میں بالکل واضح حکم رکھتی ہے، لہٰذا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہی وہ پہلی قرآنی آیت ہے جس کے ذریعے سے مسلمانوں کو حرمتِ رِبا کا واضح حکم ملا، اسی وجہ سے صحیح البخاری کے معروف شارح علامہ حافظ ابنِ حجر العسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں[1] کہ ممانعتِ رِبا کا اعلان غزوۂ اُحد کے آس پاس زمانے میں کیا گیا، بلکہ بعض شراحِ حدیث اور مفسرینِ کرامؒ نے اس بات کی وجہ بھی بیان کی ہے کہ ممانعتِ رِبا کا حکم غزوۂ اُحد کے قریبی زمانے میں کیوں آیا؟ وہ کہتے ہیں کہ: مکہ کے حملہ آوروں نے اپنی فوج کو سودی قرضوں کے ذریعے سرمایہ مہیا کیا تھا۔

اسی طرح انہوں نے اچھا خاصا اسلحہ جمع کرلیا تھا، یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ بات مسلمانوں کو بھی اسی طریقے پر لوگوں سے سودی قرضے لے کر اسلحہ جمع کرنے پر اُبھار سکتی تھی، مسلمانوں کو اس عمل سے روکنے کے لئے یہ واضح طور پر ممانعت کرنے والی آیتِ رِبا نازل ہوئی۔[2]

۲۱:- یہ بات کہ ممانعتِ رِبا کا حکم غزوۂ اُحد کے قریبی زمانے میں آیا، اس کی تائید سنن ِ ابی داؤد میں مذکور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے روایت کردہ ایک واقعے سے بھی ہوتی ہے، وہ واقعہ یہ ہے کہ عمرو بن اقیش ایک ایسا شخص تھا جس نے سود پر قرضہ دے رکھا تھا، وہ اسلام قبول کرنے کی طرف راغب تھا، تاہم وہ ایسا کرنے سے اس لئے متردّد تھا کہ اسے یہ پتہ تھا کہ اگر وہ اسلام لے آیا تو وہ اپنی سودی رقم وصول نہ کرپائے گا، اس لئے اس نے اسلام قبول کرنے میں تأخیر کی، اسی دوران جنگِ اُحد چھڑ گئی، تب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسلام لانے کو مؤخر نہیں کرے گا، اور وہ میدانِ معرکہ میں آیا اور مسلمانوں کی طرف سے لڑنے لگا، یہاں تک کہ وہ اسی معرکے

(۱) ابن حجر العسقلانی: فتح الباری، مکہ مکرمہ ۱۹۸۱ء ج:۸ ص:۲۰۵۔

(۲) الرازی: التفسیر الکبیر، مطبوعہ ایران ج:۹ ص:۲۔

میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوا۔[1]

۲۲:- یہ روایت صاف طریقے سے واضح کرتی ہے کہ ربا غزوۂ اُحد سے پہلے سے ممنوع تھا، اور یہی وجہ عمرو بن اقیش کے اسلام لانے میں تردّد کی وجہ بنی ہوئی تھی۔

۲۳:- آیات کا چوتھا مجموعہ سورۃ البقرہ میں مذکور ہے، جس میں حرمتِ ربا کی شدّت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے، ان آیات کے نزول کا پسِ منظر یہ ہے کہ فتحِ مکہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام واجب الاداء سودی رقوم کو منسوخ (Void) کردیا تھا، اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ کوئی شخص بھی اپنے فراہم کردہ قرضے پر سود کا مطالبہ نہیں کرسکتا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا رُخ فرمایا، جو فتح نہ کیا جاسکا، لیکن بعد میں طائف کے باشندے جو زیادہ تر طائف کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، اسلام لائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک معاہدہ کیا، اس مجوزہ معاہدے کی ایک شق یہ بھی تھی کہ بنوثقیف اپنے مقروضوں کے قرضوں پر سودی رقوم معاف نہیں کریں گے، لیکن ان کے قرض خواہ (Creditors) ان پر عائد سود کو معاف کردیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاہدے پر دستخط کرنے کے بجائے اس مسودے پر صرف ایک جملہ لکھ کر بھیج دیا کہ بنوثقیف بھی ویسا ہی حق رکھیں گے جیسا کہ مسلمان رکھتے ہیں[2]، بنوثقیف اس تأثر میں تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا معاہدہ قبول کرچکے ہیں، اس لئے انہوں نے بنوعمرو بن المغیرہ سے اپنی سودی رقوم کا مطالبہ کردیا، لیکن بنوعمرو نے ان کے مطالبے کو سود کے ممنوع ہوجانے کی وجہ سے مسترد کردیا، مقدمہ مکہ مکرمہ کے گورنر عتاب بن اسید کے پاس پیش ہوا، بنوثقیف کی دلیل یہ تھی کہ معاہدے کی رُو سے

(۱) ابوداؤد: السنن، حدیث: ۲۵۳۷ ج:۳ ص:۲۰۔

(۲) ابنِ عطیہ: المحرر الوجیز، دوحہ ۱۹۷۷ء ج:۲ ص:۴۸۹۔

وہ سودی رقوم معاف کرنے پر مجبور نہیں ہیں، عتاب بن اسید نے معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رکھا تو اس موقع پر مندرجہ ذیل قرآنی آیات نازل ہوئیں:-

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ.

ترجمہ:- اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور جس قدر سود مقروضوں کے ذمہ رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہوجاؤ، اور اگر تم اس سے توبہ کرتے ہو تو تمہارے لئے یہ حکم ہے کہ اپنی اصل رقم لے لو اور سود چھوڑ دو، نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ تمہارے ساتھ ظلم کیا جائے۔

۲۴:- اس موقع پر بنوثقیف نے سرِ تسلیم خم کرلیا اور کہنے لگے:-
ہمارے اندر اتنی سکت نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ چھیڑیں۔[1]

رِبا کی حرمت کا وقت

۲۵:- قرآنِ کریم کی ان آیات کو ان کے تاریخی پسِ منظر کی روشنی میں مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ رِبا کم از کم ہجرت کے دُوسرے سال میں حرام قرار دے دیا گیا تھا، البتہ یہ بات مشکوک ہے کہ آیا اس سے

(۱) ابن جریر: جامع البیان ج:۳ ص:۱۰۷۔ الواحدی: الوسیط ج:۱ ص:۳۹۷۔ ابن عطیہ ج:۲ ص:۴۸۹۔ الواحدی: اسباب النزول، ریاض ۱۹۸۴ء، ص:۸۷۔

قبل حرام تھا یا نہیں؟ اگر سورۂ رُوم کی آیت میں استعمال کردہ لفظِ ''رِبا'' بعض محققین کے قول کے مطابق سود کے معنیٰ میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآنِ کریم نے مکی زندگی میں ہی فعلِ رِبا کو شنیع قرار دے دیا تھا، اسی وجہ سے علمائے کرام کی بہت بڑی تعداد اس بات کی قائل ہے کہ رِبا اسلام میں کبھی بھی حلال نہیں رہا، وہ تو بالکل ابتداء سے حرام تھا، تاہم اس کی شناعت اور شدّت پر اس وقت زیادہ زور نہیں دیا گیا، کیونکہ اس وقت کفارِ مکہ مسلمانوں کو تعذیب اور اذیتیں دے رہے تھے، اور اس وقت مسلمانوں کی فکر کا زیادہ تر محور ایمان کے بنیادی ارکان کا قیام اور حفاظت تھی، چنانچہ اس وقت ان کے پاس رِبا کے مسئلے میں اُلجھنے کا موقع نہ تھا، بہرحال کم ازکم اتنی بات تو ضرور ثابت ہوجاتی ہے کہ رِبا کی واضح ممانعت بلاشبہ سنہ۲ھ میں آچکی تھی۔

۲۶:- بعض اپیل کنندگان کا موقف یہ تھا اور وہ اس بات پر مصر رہے کہ رِبا کی ممانعت اور حرمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری سال آئی ہے، یہ حضرات اپنے موقف کو تین مختلف روایات سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

۲۷:- پہلی روایت: یہ بات بہت ساری روایات میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رِبا کی حرمت کا اعلان اپنے آخری خطبۂ حج (حجۃ الوداع) کے موقع پر فرمایا، اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف رِبا کی حرمت کا اعلان فرمایا، بلکہ یہ اعلان فرمایا کہ پہلا سود جسے ختم کیا جارہا ہے وہ ان کے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب کو ادا کیے جانے والا سود ہے، یہ اعلان ظاہر کرتا ہے کہ پہلا سود جسے ختم کیا گیا وہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کا سود تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ رِبا کی حرمت حجۃ الوداع یعنی سنہ۱۰ھ سے قبل مؤثر نہیں تھی۔

۲۸:- متعلقہ مواد کا گہرا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ یہ دلیل مغالطے پر مبنی ہے، درحقیقت رِبا کی حرمت کم ازکم سنہ۲ھ سے مؤثر تھی، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کا سب سے

بڑا اجتماع تھا، اسلام کے بنیادی اَحکامات کا اعلان کرنا مناسب خیال فرمایا، اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دورِ جاہلیت کے مروّجہ بہت سے ایسے افعال جو اسلام میں ممنوع تھے، ان کا اعلان بھی فرمایا، لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ افعال اس سے پہلے ممنوع نہ تھے، مثال کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر انسانی زندگی اور عزّت کی عظمت و حرمت بیان فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی حرمت کا اعلان فرمایا، عورتوں کے ساتھ بدسلوکی، غیبت اور آپس میں جھگڑوں سے بچنے کی تاکید فرمائی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام اَحکام بہت عرصہ پہلے ہی سے مؤثر تھے، لیکن پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر ان کا اعلان فرمایا، تاکہ تمام سامعین ان سے مکمل طور سے آگاہ ہوجائیں، اور کوئی بھی ان اَحکامات سے لاعلمی کا دعویٰ نہ کرسکے۔

بالکل یہی معاملہ رِبا کے بارے میں بھی پیش آیا کہ وہ اصل میں کافی عرصہ قبل ہی ممنوع قرار دیا جاچکا تھا، مگر اس کا مکرّر اعلان واضح طور پر اس موقع پر دوبارہ کیا گیا، اسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان بھی فرمایا کہ آئندہ سود کا کوئی دعویٰ بھی قابلِ قبول نہ ہوگا، یہ وہ وقت تھا جب جزیرۂ عرب میں بہت بڑی تعداد میں عرب قبائل حلقہ بگوش اسلام ہورہے تھے، عملِ رِبا ان کے درمیان پھیلا ہوا تھا، اور یہ بات متصوّر تھی کہ وہ ایک دُوسرے سے اپنے سود کا دعویٰ کرتے رہیں گے، اسی وجہ سے اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب سمجھا کہ نہ صرف سود کو ممنوع قرار دینے کا اعلان کیا جائے، بلکہ سابقہ تمام سودی معاملات کو کالعدم قرار دے دیا جائے۔

اسی سیاق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب کو ادا کئے جانے والے سود کی معافی اور خاتمہ کا بھی اعلان فرمادیا، یہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ آپ کے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب سنہ ۸ھ میں فتح مکہ سے کچھ عرصہ قبل ہی مسلمان ہوئے تھے، اسلام لانے سے قبل وہ لوگوں کو سودی قرضہ دیا کرتے تھے، اور

ان کے مقروضوں کے ذمہ ان کی بہت بھاری رقوم واجب الادا تھیں[1]، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فتحِ مکہ کے بعد وہ مدینہ منورہ ہجرت کر گئے تھے اور وہ اپنے مقروضوں سے اپنے قرضوں کا تصفیہ نہ کروا پائے تھے، چنانچہ جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کا سفر فرمایا، تو اب ان کے لئے اپنے قرضوں کے تصفیہ کرانے کا پہلا موقع ملا تھا، اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمادیا کہ وہ تمام سودی رقوم جو ان کے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب کے لئے واجب الادا تھیں، اب وہ کالعدم اور غیر واجب الادا ہیں، اس اعلان کے اندر لفظ ''پہلا'' کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے کے ربا واجب الادا یا کالعدم نہ تھے، بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ وہ پہلی سودی رقم ہے جسے اس خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر کالعدم قرار دینے کا اعلان کیا جارہا ہے۔

ہم پہلے بنو ثقیف کے حوالے سے یہ بات ذکر کرچکے ہیں کہ انہوں نے فتحِ مکہ کے بعد (یعنی حجۃ الوداع سے تقریباً دو سال قبل) اپنے مقروضوں سے سودی رقوم کا دعویٰ کیا تھا، لیکن اس وقت ان کی سودی رقوم کے دعوے کو مسترد کردیا گیا تھا، اس لئے یہ بات صحیح نہیں ہے کہ عباسؓ بن عبدالمطلب کا سود، کالعدم قرار دیئے جانے والا پہلا سود تھا، اور نہ ہی یہ دعویٰ صحیح ہے کہ حرمتِ ربا کا حکم پہلی بار حجۃ الوداع کے موقع پر نافذ العمل ہوا۔

قرآنِ کریم کی آخری آیت

۲۹:- یہ نظریہ کہ ربا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دورِ حیات میں حرام کیا گیا اس کی تائید میں دُوسری دلیل وہ روایت پیش کی جاتی ہے، جو امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے نقل کی ہے، جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا:-

---

(۱) الواحدی۔

اخر ایۃ نزلت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایۃ الربا.

ترجمہ:- آخری آیت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، وہ آیتِ رِبا ہے۔

۳۰:- لیکن سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ شریعت کا آخری حکم رِبا کی حرمت تھی، وہ تو صرف یہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی آخری آیت رِبا کی تھی، جس کا اس جملے میں بلاشبہ یہ مطلب ہے کہ اس سے مراد سورۂ بقرہ کی وہ آیات ہیں جو پیچھے نقل کی گئیں، اس روایت میں لفظِ "ایۃ الرِّبا" صرف اس کے عنوان کے طور پر مذکور ہے۔

لہٰذا اگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے جملے کو ظاہری الفاظ پر بھی محمول کیا جائے تو بھی یہ اس بات کا اظہار ہے کہ سورۂ آل عمران، سورۂ نساء اور سورۂ رُوم کی آیات کا نزول سورۂ بقرہ کی ان آیات سے پہلے ہو چکا تھا، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حرمتِ رِبا کا حکم سورۂ بقرہ کی ان آیات کے نزول سے پہلے ہی آ گیا تھا۔

اسی لئے یہ بات عیاں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس ارشاد کا مطلب یہ نہیں لیا جاسکتا کہ حرمتِ رِبا کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دورِ حیات میں آیا تھا۔

۳۱:- مزید یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہی ارشاد بہت سارے دُوسرے علمائے کرام مثلاً ابنِ جریر الطبریؒ سے بھی مروی ہے، جو اس کی یہ تشریح کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ ارشاد صرف مندرجہ ذیل آیت سے متعلق ہے:-

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللهِ، ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ. (۲:۲۸۱)

ترجمہ:- اور ڈرتے رہو اس دن سے کہ جس دن لوٹائے جاؤ گے

اللہ کی طرف، پھر پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا،
اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

۳۲:- چونکہ یہ آیت موجودہ شکل میں آیاتِ رِبا (۲۷۵ تا ۲۸۰) کے فوراً بعد رکھی گئی ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اسے آیتِ رِبا فرمادیا ہے، یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس ارشاد کو کتاب التفسیر کے اس باب میں ذکر فرمایا جس میں سورۂ بقرہ کی صرف آیت نمبر ۲۸۱ کی تفسیر ہے، نہ کہ باب نمبر ۴۹ تا ۵۲ میں، جو آیاتِ رِبا یعنی ۲۷۵ تا ۲۸۰ سے متعلق ہیں۔[1]

اس تشریح کی روشنی میں یہ بات زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نزدیک سورۂ بقرہ کی وہ آیات جو حرمتِ رِبا کی شدت بیان کرنے پر مشتمل ہیں، یعنی آیات نمبر ۲۷۵ تا ۲۸۰، وہ پہلے نازل ہوچکی تھیں، اور یہ آیت: ۲۸۱ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دنوں میں نازل ہوئی۔ اس بات کی مزید تائید اس حقیقت سے بھی ہوسکتی ہے کہ آیت: ۲۷۸ یقینی طور پر فتحِ مکہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی جب طائف کے قبیلۂ بنوثقیف نے بنومغیرہ سے اپنے سود کی اس رقم کا مطالبہ کیا جس کا واقعہ پیچھے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاچکا ہے، مکہ مکرمہ کی فتح سنہ ۸ھ میں ہوئی، جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال سنہ ۱۱ھ میں ہوا، اس بات کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے کہ تین سال سے زائد لمبے عرصے تک کوئی اور آیت نازل نہیں ہوئی، اس لئے یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ آیتِ رِبا سے ان کی مراد صرف آیت نمبر: ۲۸۱ ہے، جو ان کے مطابق الگ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دورِ حیات میں نازل ہوئی تھی اور یہ بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ذاتی رائے ہی تھی، کیونکہ کچھ دُوسرے صحابہ کرامؓ دُوسری آیات کو قرآنِ پاک کی آخری نازل شدہ آیت قرار دیتے ہیں، اس مسئلے پر علامہ سیوطیؒ کی کتاب ''الاتقان'' میں اور دُوسری تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں تفصیل

(۱) دیکھئے فتح الباری ج:۸ ص:۲۰۵۔

کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

۳۳:- یہ ساری تفصیل اس بات کو ثابت کرنے کے لئے بہت کافی ہے کہ رِبا کی حرمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دورِ حیات سے بہت پہلے آچکی تھی۔

۳۴:- مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ اگرچہ رِبا کی ناپسندیدگی کے بعض اشارے مکی زندگی ہی میں ملتے ہیں، تاہم اس کی واضح حرمت قرآنِ پاک کے ذریعہ سنہ۲ھ غزوۂ اُحد کے قریبی زمانے میں نازل ہوئی۔

۳۵:- تیسری روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر ہے، جس پر بعض اپیل کنندگان اعتماد کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رِبا کی حرمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانے میں آئی، ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول پر تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ پیراگراف نمبر ۵۶ میں غور کریں گے۔

رِبا سے مراد کیا ہے؟

۳۶:- اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ رِبا سے کیا مراد ہے؟ قرآنِ کریم نے رِبا کی تعریف اس لئے بیان نہیں فرمائی کیونکہ یہ بات واضح تھی کہ رِبا قرآنِ کریم کے مخاطبین کے لئے ایک معروف فعل تھا، یہ بالکل حرمتِ خمر، قمار اور زنا کی طرح تھا کہ جس کی حرمت بھی بغیر کسی جامع مانع تعریف کے عمل میں آئی، اور اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ سب چیزیں اتنی واضح اور غیر مبہم تھیں کہ ان کی تعریف کی ضرورت نہ تھی۔ بالکل یہی حالت رِبا کی بھی تھی کہ وہ ان کے لئے اجنبی نہ تھا، وہ سب اس اصطلاح کو اپنے روزمرّہ معاملات میں استعمال کرتے تھے، نہ صرف عرب بلکہ تمام سابقہ معاشرے اسے اپنے مالیاتی معاملات میں استعمال کیا کرتے تھے، اور کسی کو بھی اس کی حقیقی تعریف کی ضرورت نہ تھی، ہم بہت پہلے سورۃ النساء کی آیت کا حوالہ دے چکے ہیں، جہاں پر قرآنِ کریم نے یہودیوں کے سود کھانے کی مذمت فرمائی ہے، باوجودیکہ وہ ان پر پہلے سے حرام تھا، یہاں یہ عمل بھی اسی طرح رِبا سے تعبیر کیا گیا،

جس طرح یہ سورۂ آل عمران اور سورۂ بقرہ میں تعبیر کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ عملِ رِبا مسلمانوں کے لئے بالکل اسی طرح ممنوع ہے جس طرح یہودیوں کے لئے ممنوع تھا۔

بائبل میں رِبا

۳۷:- یہ ممانعت ابھی تک بائبل کے پرانے صحیفوں میں موجود ہے، درج ذیل اقتباسات حوالے کے طور تائید کے لئے پیش کئے جاتے ہیں:-

Thou shalt not lend upon usury to thy brother, usury of money, usury of victuals, usury of any thing that is lent upon usury. (Deuteronomy 23:19)

ترجمہ:- تم اپنے بھائی کو سود پر قرضہ نہ دو، روپے کا سود، صَرفی اشیاء کا سود، اور کسی بھی چیز کا سود جو سود پر قرضہ دیا جائے۔

Lord, who shall abide in thy tabernacle? Who shall dwell in thy holy hill? He that walketh uprightly, and worketh righteousness and speaketh the truth in his heart. He that putteth not out of his money to usury, nor taketh reward against the innocent. (Psalms 15: 1, 2, 5)

ترجمہ:- اے خدا! کون قربان گاہ میں رہے گا؟ کون مقدس پہاڑی پر رہے گا؟ وہ شخص جو کہ سیدھے راستے پر چلے گا، سچائی اور صحیح طریقے سے کام کرے گا، دِل سے سچ بولے گا، وہ جو کہ اپنی رقم سود پر نہیں چڑھائے گا، نہ ہی کسی معصوم کا حق مارے گا۔

He that by usury and unjust gain increaseth his substance, he shall gather it for him that will pity the poor. (Proverbs 28:8)

ترجمہ:- وہ شخص جو کہ سود اور ناجائز ذرائع سے دولت بڑھاتا

ہے، وہ اسے اپنے لئے جمع کرتا ہے جو غریب کے لئے افسوس ہے۔

Then I consulted with myself, and I rebuked the nobles, and rules and said unto them, Ye exact usury, every one of his brother. And I set a great assembly against them. (Nehemiah 5: 7)

ترجمہ:- تب میں نے اپنے آپ سے مشورہ کیا، اور معززین کو ڈانٹا اور قوانین دیکھے اور ان سے کہا: تم اپنے ہر بھائی سے سود لیتے ہو اور میں نے ایک بڑا اجتماع ان کے خلاف تیار کرلیا۔

He that hath not given forth upon usury, neither hath taken any increase, that hat withdrawn his hand from iniquity, hath executed true judgment between man and man, hath walked in my statues, and hath kept my judgments, to deal truly; he is just. He shall surely live, said the Lord God. (Ezekiel 18: 8, 9)

ترجمہ:- اور سود پر قرض نہ دے، اور ناحق نفع نہ لے، اور بدکرداری سے دست بردار رہے، اور لوگوں کے درمیان سچا انصاف کرے، اور میرے قوانین پر چلے، اور میری قضاؤں کو حفظ کرکے عمل میں لائے تو وہ یقیناً صادق ہے اور زندہ رہے گا (یوں مالک خداوند کا فرمان ہے)۔

In thee have they taken gifts to shed blood; thou hast taken usury and increases, and though hast greedily gained of they neighbours by extortion, and hast forgotten me, said the Lord God. (Ezekiel 22: 12)

ترجمہ:- تجھ میں خون کے لئے رشوت لی جاتی ہے، اور سود اور

ناحق نفع لیا جاتا ہے، اور لالچ کے باعث ہمسائے پر ظلم کیا جاتا
ہے، اور تو نے مجھے فراموش کردیا (مالک خداوند کا فرمان یوں
ہی ہے)۔

۳۸:- بائبل کے ان مختصر حوالوں میں لفظ ''یوژری'' کا استعمال ان معنوں میں ہوا ہے کہ کوئی بھی ایسی رقم جو قرض خواہ، مقروض سے اپنے قرضے کے علاوہ اور اس کے اُوپر طلب کرے، قرآنِ کریم میں جو لفظ ''الربا'' استعمال کیا گیا ہے، اس کے بھی بالکل وہی معنیٰ ہیں، کیونکہ سورۃ النساء کی آیت میں صراحۃً مذکور ہے کہ رِبا یہودیوں کے لئے بھی حرام کیا گیا تھا۔

مفسرینِ قرآن کی بیان کردہ تعریفِ رِبا

۳۹:- مزید براں کتبِ احادیث لفظِ ''الرِّبا'' کو بیان کرتے ہوئے دورِ جاہلیت کے مروّجہ اہلِ عرب کے سودی معاملات بہت تفصیل کے ساتھ ذکر کرتی ہیں، جن کی بنیاد پر مفسرینِ قرآن نے رِبا کی واضح تعریف بیان کی ہے۔

۴۰:- امام ابوبکر الجصاصؒ (المتوفی ۳۸۰ھ) اپنی مشہور کتاب اَحکام القرآن میں رِبا کی تشریح مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:-

والربا الذی کانت العرب تعرفه وتفعله انما کان قرض الدراهم والدنانير الی أجل بزيادة علی مقدار ما استقرض علی ما يتراضون به.[1]

ترجمہ:- اور وہ رِبا جو اہلِ عرب کے درمیان معروف اور مستعمل تھا، اس کی صورت یہ تھی کہ وہ درہم (چاندی کے سکے) یا دینار (سونے کے سکے) کی شکل میں مخصوص مدّت کے لئے اپنے اصل

(۱) احکام القرآن: الجصاص ج:۱ ص:۴۶۵، لاہور ۱۹۸۰ء۔

سرمایہ پر متعین اضافے کی شرط کے ساتھ قرض دیا کرتے تھے۔

۴۱:- اس عمل کی بنیاد پر مذکورہ بالا مصنف نے ربا کی درج ذیل تعریف کی ہے:-

هو القرض المشروط فيه الأجل وزيادة مال على المستقرض.

ترجمہ:- جاہلیت کا ربا یہ ہے کہ کوئی قرض متعینہ مدّت کے لئے دے اور مقروض کو اصل سرمایہ پر طے شدہ اضافے کے ساتھ واپس کرنا لازمی ہو۔

امام فخر الدین الرازیؒ نے دورِ جاہلیت میں مروّج ربا کی تفصیل یوں بیان فرمائی ہے:-

واما ربا النسيئة فهو الأمر الذى كان مشهورًا متعارفًا فى الجاهلية وذلك أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا كل شهر قدرًا معينًا، ويكون رأس المال باقيًا، ثم اذا حل الدّين طالبوا المديون برأس المال، فان تعذر عليه الأداء زادوا فى الحق والأجل، فهٰذا هو الربا الذى كانوا فى الجاهلية يتعاملون به.(۱)

ترجمہ:- جہاں تک ربا النسیئۃ کا تعلق ہے، تو یہ دورِ جاہلیت کا ایک مشہور و معروف عقد تھا، اور وہ یہ کہ لوگ اس شرط کے ساتھ روپے دیا کرتے تھے کہ وہ ایک متعین رقم ماہانہ وصول کیا کریں گے، اور اصل سرمایہ ویسا ہی واجب الادا رہے گا، پھر مدّت کے اختتام پر وہ مقروض سے اصل سرمایہ کی واپسی کا

(۱) التفسیر الکبیر: للامام الرازیؒ ج:۷ ص:۹۱ مطبوعہ تہران۔

مطالبہ کرتے تھے، اب اگر وہ ادا نہ کرسکا تو وہ مدّت اور واجب
الادا رقم بڑھا دیتے تھے، یہ تھا وہ رِبا جو جاہلیت کے زمانے میں
رائج رہا ہے۔

۴۲: بالکل یہی وضاحت ابنِ عدیل الدمشقی نے اپنی مفصل تفسیر اللباب
میں بیان فرمائی ہے۔ (ج:۴ ص:۴۴۸)

۴۳:- رِبا الجاہلیہ کی تفصیلی وضاحت

وفاقِ پاکستان کے وکیل محترم ریاض الحسن گیلانی صاحب نے ہمارے سامنے یہ دلیل پیش کی کہ قرآنِ کریم نے جس رِبا کو حرام قرار دیا ہے، وہ ایک مخصوص قسم کا عقد تھا جس میں قرض دیتے وقت کوئی اضافہ طے نہیں کیا جاتا تھا، تاہم اگر مقروض مدّت کے اختتام پر رقم ادا نہ کرسکتا تو قرض خواہ اس کے سامنے دو اختیار رکھتا تھا، یا تو وہ اصل سرمایہ واپس کردے ورنہ اس اضافہ مدّت کے بدلے رقم میں اضافہ کردے۔ فاضل وکیل صاحب نے یہ موقف اختیار کیا کہ جاہلیت کے زمانے میں قرضہ دیتے وقت اصل سرمایہ پر اضافہ کی کوئی شرط عائد نہ کی جاتی تھی، اس لئے کوئی بھی اضافی رقم جب قرض کے اصل معاملے پر طے کی جائے وہ رِبا القرآن کی تعریف کے ذیل میں نہیں آتی، تاہم وہ رِبا الفضل کی تعریف کے زُمرے میں بے شک داخل ہوجاتی ہے، جو کہ صرف مکروہ یا ناپسندیدہ عمل ہے۔

۴۴:- فاضل وکیل صاحب نے بعض مفسرینِ کرامؒ کی روایات کا حوالہ بھی دیا، مثلاً انہوں نے مشہور و معروف تفسیر ابنِ جریر الطبری کا حوالہ دیا جو کہ مجاہدؒ کے حوالے سے رِبا الجاہلیہ کی اس طرح وضاحت کرتی ہے:-

کانوا فی الجاهلية يكون للرجل الدَّين، فيقول: لک
كذا وكذا وتؤخر عني.

ترجمہ:- دورِ جاہلیت میں ایک شخص کے ذمہ اپنے قرض خواہ کا
قرضہ واجب الادا ہو جاتا تھا، پھر وہ اپنے قرض خواہوں سے کہتا
تھا کہ: میں تمہیں اتنی اتنی رقم کی پیشکش کرتا ہوں اور تم مجھے ادا
کرنے کی مزید مہلت دو۔

۴۵:- بالکل یہی تشریح دُوسرے بہت سے مفسرینِ قرآن سے بھی منقول ہے، جناب ریاض الحسن گیلانی نے دلیل دی کہ ان روایات میں اصل سرمایہ پر کسی متعین اضافہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، جس چیز کا ذکر ہے وہ یہ ہے کہ مدت کے اختتام پر اضافے کی پیشکش یا مطالبہ کیا جاتا تھا، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کا حرام کردہ سود وہ ہے جس میں مدّت کے اختتام پر قرض خواہ کی جانب سے مدّت بڑھانے کی وجہ سے اضافی رقم کا مطالبہ کیا جائے، اگر کوئی اضافی رقم عقدِ قرض کی ابتداء میں طے کرلی جائے تو وہ رِبا القرآن میں شامل نہ ہوگی۔

۴۶:- محترم وکیل صاحب کے ان دلائل نے ہمیں بالکل متأثر نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ تفسیر کے اصل مآخذ کے متعلقہ مواد کے محتاط مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اصل سرمایہ پر اضافہ کا مطالبہ جاہلیت کے زمانے میں مختلف طریقوں سے ہوتا تھا، پہلا یہ کہ قرض دیتے وقت قرض خواہ اصل سرمایہ پر ایک اضافی رقم کا مطالبہ کیا کرتا تھا، اور یہ بات قرض کے معاہدے میں واضح شرط کے طور پر طے کی جاتی تھی، جس کا ذکر امام الجصاصؒ کی تصنیف ''اَحکام القرآن'' کے حوالے سے پیچھے کیا جاچکا ہے، دُوسری قسم امام رازیؒ اور ابنِ عدیلؒ کے حوالے سے پیچھے گزر چکی ہے کہ قرض خواہ مقروض سے ایک متعین ماہانہ آمدنی کا مطالبہ کیا کرتا تھا، جبکہ اصل سرمایہ مدّت کے اختتام تک بحال رہتا تھا۔

تیسری قسم مجاہدؒ کے حوالے سے فاضل ایڈووکیٹ نے ذکر فرمائی ہے، لیکن اس کی مکمل تشریح قتادہؒ کے حوالے سے ابنِ جریرؒ نے درج ذیل الفاظ میں خود بیان

فرمائی ہے:-

عن قتادة ان ربا الجاهلية بيع الرجل البيع الى أجل مسمّى، فاذا حل الأجل ولم يكن عند صاحبه قضاء زاده وأخر عنه.(۱)

ترجمہ:- جاہلیت کے زمانے کا رِبا یہ تھا کہ ایک شخص متعین مدّت کے اُدھار پر کوئی چیز فروخت کرتا تھا، جب وہ مدّت آجاتی اور خریدار قیمت کی ادائیگی نہ کرسکتا تو بیچنے والا قیمت میں اضافہ کرکے خریدار کو مزید وقت کی مہلت دے دیتا تھا۔

۴۸:- بالکل یہی تفصیل علامہ سیوطیؒ نے فریابی کے حوالے سے بھی مذکورہ ذیل الفاظ میں بیان فرمائی ہے:-

كانوا يتباعون الى الأجل، فاذا حلّ الأجل زادوا عليهم وزادوا في الأجل.(۲)

ترجمہ:- وہ اشیاء اُدھار ادائیگی پر خریدا کرتے تھے، مگر مدت کے اختتام پر فروخت کرنے والے واجب الادا رقم بڑھا کر ادائیگی کی مدت میں اضافہ کردیا کرتے تھے۔

۴۹:- ان حوالہ جات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ معاملات جن میں قرض خواہ مدّت کے اختتام پر ایک اضافی رقم کا مطالبہ کیا کرتے تھے، وہ قرض کے معاملات نہ تھے، بلکہ ابتداء میں وہ اُدھار پر اشیاء کی فروختگی کے معاملات تھے، جن میں بیچنے والا تأخیر سے ادائیگی کی صورت میں زیادہ قیمت کا مطالبہ کیا کرتا تھا، لیکن جب خریدار وقتِ مقرّرہ پر بھی ادائیگی پر قادر نہ ہوتا تو وہ مدّت میں اضافہ کرتے ہوئے

(۱) ابنِ جریر: تفسیر ج:۳ ص:۱۰۱۔
(۲) السیوطی: لباب النقول ص:۳۰۔

اس کے بدلے قیمت میں بھی اضافہ کرتا رہتا تھا۔

یہی وہ مخصوص معاملہ ہے جس کا ذکر حضرت مجاہدؒ نے کیا ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے لفظِ ''قرض'' استعمال نہیں کیا، بلکہ لفظِ ''دَین'' (واجب الادا رقم) استعمال کیا ہے، جو کہ عموماً خرید و فروخت کے معاملے میں پیدا ہوتا ہے۔

۵۰:- ربا کی یہ شکل مفسرینِ قرآن نے بکثرت ذکر فرمائی ہے، کیونکہ وہ ربا کی آیات میں سے ایک مخصوص جملہ کی وضاحت کرنا چاہتے تھے، جو کہ درج ذیل ہے:-

فَالُوٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا.

ترجمہ:- کفار کہتے ہیں کہ خرید و فروخت بھی تو ربا کی مانند ہے۔

۵۱:- کفار کا یہ قول واضح طور پر خرید و فروخت کی مذکورہ بالا مخصوص قسم کی طرف اشارہ کر رہا ہے، کیونکہ ان کا اعتراض یہ تھا کہ جب ہم اُدھار فروخت کرنے کی صورت میں کسی چیز کی قیمت ابتداء ہی سے زیادہ رکھتے ہیں تو اسے جائز کہا جاتا ہے، لیکن جب ہم مدّت کے اختتام پر خریدار کی عدم ادائیگی کی صورت میں واجب الادا رقم میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو اسے ربا کہا جاتا ہے، حالانکہ دونوں صورتوں میں اضافہ بظاہر یکساں معلوم ہوتا ہے، کفارِ مکہ کا یہ اعتراض خاص طور پر مشہور مفسر ابنِ ابی حاتم نے سعید بن جبیرؒ کے حوالے سے بھی ذکر کیا ہے:-

قالوا سواء علينا ان زدنا في أوّل البيع أو عند محل المال، فهما سواء، فذلك قوله: قَالُوٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا.[1]

ترجمہ:- وہ یہ کہا کرتے تھے کہ یہ بات برابر ہے کہ خواہ ہم قیمت میں ابتدائے عقد میں اضافہ کردیں یا ہم مدّت کے اختتام پر

---

(۱) تفسیرِ ابنِ ابی حاتم ج:۲ ص:۳۵۴، مکہ ۱۹۹۷ء۔

اسے بڑھائیں دونوں صورتیں یکساں ہیں، یہی اعتراض ہے
جسے قرآنِ کریم کی آیت میں یہ کہہ کر ذکر کیا گیا ہے: کفار کہتے
ہیں کہ خرید و فروخت تو بالکل رِبا کی مانند ہے۔

۵۲:- بالکل یہی تشریح ابوحیانؒ نے البحر المحیط میں اور متعدّد دُوسرے قدیم مفسرینِ قرآن نے ذکر فرمائی ہے۔[1]

۵۳:- مذکورہ تفصیل سے یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ مدّت کے اختتام پر اضافے کا عمل دو مختلف صورتوں سے متعلق ہے، ایک وہ صورت ہے جہاں اصل معاملہ کسی چیز کی فروختگی کا ہوتا تھا، جیسا کہ قتادہ، فاریابی، سعید بن جبیر (رحمہم اللہ) وغیرہ نے ذکر فرمایا ہے، اور دُوسری صورت وہ تھی جہاں اصل عقد، قرض کا تھا، اور اس پر قرض خواہ کی طرف سے ماہانہ سود وصول کیا جاتا تھا، اور مدّت کے اختتام تک اصل سرمایہ اتنا ہی برقرار رہتا تھا، اور اگر مقروض اصل سرمایہ اس وقت تک ادا نہ کرسکتا تو قرض خواہ مدّت میں اضافہ کرکے اس کے بدلے واجب الادا رقم میں بھی اضافہ کردیتا تھا، جیسا کہ پیچھے امام رازیؒ اور ابنِ عدیلؒ کے حوالے سے پیراگراف نمبر۴۲ اور۴۳ میں گزر چکا ہے۔

۵۴:- اس طرح یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ وہ رِبا جسے قرآنِ کریم نے حرام قرار دیا ہے وہ صرف اس صورت تک منحصر نہیں ہے، جسے وفاقِ پاکستان کے وکیل جناب ریاض الحسن گیلانی نے بیان کیا ہے، دراصل رِبا کی مختلف صورتیں تھیں اور وہ سب کی سب جاہلیت کے عربوں میں رائج تھیں۔ ان تمام معاملات میں مشترک بات یہ تھی کہ اُدھار کی رقم پر ایک اضافی رقم کا مطالبہ کیا جاتا تھا، پھر بعض اوقات یہ اُدھار خرید و فروخت کے عقد کے ذریعے سے پیدا ہوتا اور بعض اوقات قرضہ دینے کے ذریعے پیدا ہوتا۔ اسی طرح اضافی رقم بعض مرتبہ ماہانہ وصول کی جاتی، جبکہ اصل سرمایہ

---

(۱) ابوحیان: البحر المحیط ج:۲ ص:۳۳۵۔

متعینہ مدّت میں ادا کیا جاتا تھا، اور بعض مرتبہ یہ اضافی رقم اکٹھی اصل سرمایہ کے ساتھ وصول کی جاتی۔ ان تمام شکلوں کو "رِبا" کہا جاتا تھا، کیونکہ اس اصطلاح کے لغوی معنیٰ "اضافے" کے ہیں۔

اسی وجہ سے مفسرینِ قرآن مثلاً امام ابوبکر الجصاصؒ نے اس اصطلاح کی تعریف درج ذیل الفاظ میں بیان کی ہے:

هو القرض المشروط فيه الأجل وزيادة مال علي المستقرض.

ترجمہ:- جاہلیت کا رِبا وہ قرض ہے جو ایک متعینہ مدّت کے لئے اصل سرمایہ پر اضافہ کے عوض مقروض کو دیا جاتا ہے۔

۵۵:- اب ہم ان دُوسرے دلائل کی طرف آتے ہیں جنہیں ہمارے سامنے حرمتِ رِبا کے خلاف پیش کیا گیا۔

رِبا کا تصور مبہم ہونے کے بارے میں حضرت عمرؓ کا ارشاد

۵۶:- حبیب بینک لمیٹڈ کے وکیل جناب ابوبکر چندریگر نے مرحوم جسٹس قدیرالدین کے روزنامہ ڈان مؤرخہ ۱۲/اگست ۱۹۹۷ء میں شائع شدہ مضمون کو اپنے دلائل کی بنیاد بنایا ہے، اس مضمون میں جسٹس قدیرالدین مرحوم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ قرآنِ کریم میں استعمال شدہ "رِبا" کی اصطلاح ایک مبہم اصطلاح ہے، اس کے صحیح معنیٰ کسی شخص کو، یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ تک کو معلوم نہ تھے، وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا حوالہ دیتے ہیں کہ: "آیاتِ رِبا قرآنِ کریم کی آخری آیات میں سے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی وضاحت کرسکنے سے قبل ہی اس دُنیا سے تشریف لے گئے، لہٰذا رِبا اور ہر قسم کی شک اور شبہ والی چیز کو چھوڑ دو۔" بالکل یہی دلیل متعدّد اپیل کنندگان کی طرف سے ان کی اپیل کی

درخواستوں میں پیش کی گئی ہے، یہاں تک کہ بعض اپیل کنندگان نے آیاتِ ربا کو متشابہات میں شمار کیا ہے، انہوں یہ دلیل دی کہ قرآنِ پاک نے ہم سے یہ کہا ہے کہ صرف ان آیات کا اتباع کیا جائے جو معانی کے لحاظ سے بالکل واضح (محکمات) ہوں، اور متشابہات کی اتباع نہ کی جائے۔ ان اپیل کنندگان کے مطابق ربا کی آیات دُوسری قسم میں داخل ہونے کی وجہ سے قابلِ عمل نہیں ہیں۔

۵۷:- ان حضرات کی یہ دلیل بدیہی طور پر باطل ہے، کیونکہ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے جو عملِ ربا سے احتراز نہیں کرتے، کوئی شخص یہ تصوّر کیسے کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دانائے کل اور رحیم و کریم ذات کیسے ایسے عمل کے خلاف اعلانِ جنگ کرسکتی ہے جس کی صحیح حقیقت کسی کو معلوم ہی نہ ہو؟ درحقیقت ''متشابہات'' کی اصطلاح قرآنِ پاک کی سورۂ آلِ عمران کی ابتداء میں دو قسم کی قرآنی آیات کے لئے استعمال کی گئی ہے، ''متشابہات'' کی پہلی قسم میں وہ بعض الفاظ داخل ہیں جو بعض سورتوں کے شروع میں استعمال کئے گئے ہیں، اور جن کے صحیح معانی کسی کو بھی یقینی طور پر معلوم نہیں ہیں، مثلاً "الٓمٓر" لیکن ان کے صحیح معانی کا نامعلوم ہونا مسلمانوں کی زندگیوں پر کسی طرح اثرانداز نہیں ہوتا، کیونکہ شریعت کا کوئی حکم ان الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کیا گیا ہے، دُوسرے یہ کہ ''متشابہات'' کا لفظ اللہ تبارک و تعالیٰ کی کچھ ایسی صفات کے لئے استعمال ہوا ہے جن کی صحیح ماہیت کسی بھی انسان کے لئے ناقابلِ تصوّر ہے، مثال کے طور پر بعض مقامات پر ''اللہ کے ہاتھ'' کے الفاظ آئے ہیں (مثلاً ۳:۷۳، ۵:۶۴، ۴۸:۱۰)، کسی شخص کو معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کی حقیقت کیا ہے؟ اور نہ ہی یہ بات کسی کے لئے جاننا ضروری ہے، کیونکہ کوئی عملی مسئلہ اس کے معلوم ہونے پر موقوف نہیں، لیکن بعض لوگ ان کی صحیح حقیقت کی کھوج میں پڑ گئے، حالانکہ نہ اس حقیقت کا دریافت کرنا ان کی ذمہ داری تھی، نہ شریعت کا کوئی عملی حکم ان کی فہم پر موقوف تھا، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو ان

صفات کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں جستجو اور قیاسی بحثوں سے منع فرمایا ہے، کیونکہ شریعت کے واجب الاتباع اَحکام سے اِن کا کوئی تعلق نہیں ہے، چنانچہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ شریعت کے کسی عملی حکم کو ''متشابہات'' کی اصطلاح میں داخل قرار دیا گیا ہو، اس بات کا اعلان نہ صرف قرآنِ کریم نے (۲:۲۳۳ آیت میں) کیا ہے، بلکہ یہ ہر شخص کے سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو کسی ایسے حکم کا مکلف نہیں فرماتے جس پر عمل کرنا ان کی طاقت سے باہر ہو، اگر ''رِبا'' کے صحیح معنی کسی بھی شخص کو معلوم نہیں تھے تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ذمہ یہ بات لازم نہیں فرماسکتے تھے کہ وہ ربا سے اجتناب کریں۔

سورۂ بقرہ کی آیاتِ رِبا کے سادے مطالعے ہی سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ رِبا کو ایک سخت گناہ قرار دیا گیا ہے، اور اس گناہ کی شدّت اس سخت انداز میں بیان کی گئی ہے کہ اگر مسلمانوں نے اس عمل کو ترک نہ کیا تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے اعلانِ جنگ کے لئے تیار ہوجائیں۔

رِبا الفضل کے بارے میں کچھ تفصیل

۵۸:- جہاں تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا تعلق ہے، اس کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم نے جاہلیت کے رِبا کی ان تمام صورتوں کو حرام قرار دیا تھا جن کا ذکر پیچھے گزرا ہے، یہ تمام صورتیں یا تو قرض کے معاملات سے متعلق تھیں یا اس دَین کے متعلق جو بیع کے نتیجے میں وجود میں آیا ہو۔ لیکن ان آیات کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دُوسرے معاملات کو بھی حرام قرار دے دیا تھا جو پہلے رِبا قرار نہ دیئے جاتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ اس زمانے کی مروّجہ تجارتی فضا میں بارٹر (اجناس کا باہم تبادلہ) کی بعض صورتیں رِبا کے کاروبار میں لوگوں کو ملوّث کرسکتی ہیں، اہلِ عرب بعض اجناس مثلاً

گندم، جو، کھجور، وغیرہ کو ذریعۂ تبادلہ (Medium of Exchange) کے طور پر استعمال کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشیاء کو پیسے کی مانند تبادلہ کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے مندرجہ ذیل احکامات جاری فرمائے:-

الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير، والتمر بالتمر، والملح بالملح، مثلًا بمثلٍ، يدًا بيدٍ، فمن زاد أو استزاد فقد أربىٰ.

ترجمہ:- سونا سونے کے بدلے، چاندی چاندی کے بدلے، گندم گندم کے بدلے، کھجور کھجور کے بدلے (اگر بیچا جائے) تو دونوں طرف بالکل برابر ہونا چاہئے، اور دست بدست ہونا چاہئے، لہٰذا جو شخص زیادہ ادا کرے یا اضافے کا مطالبہ کرے وہ ربا کے کاروبار میں داخل ہو جائے گا۔

۵۹:- اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر گندم کا تبادلہ گندم سے کیا جا رہا ہو تو مقدار دونوں طرف بالکل برابر ہونی چاہئے، چنانچہ اگر کسی بھی طرف زیادتی یا کمی پائی جائے، تو وہ معاملہ ربا بن جائے گا، کیونکہ عرب کے قبائل میں یہ اشیاء بطور رقم کے استعمال کی جاتی تھیں اور ایک کلو گندم کو ڈیڑھ کلو گندم کے بدلے فروخت کرنے کا حکم بالکل ایک درہم کو ڈیڑھ درہم کے بدلے فروخت کرنے کی طرح تھا، تاہم اس معاملے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ربا قرار دیا، اور یہ ''ربا الجاہلیہ'' کی اصطلاح میں شامل نہیں تھا، بلکہ اسے ''ربا الفضل'' یا ''ربا السنۃ'' کا نام دیا گیا ہے۔

۶۰:- یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ربا الفضل کی حرمت کے دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص چھ چیزوں کا ذکر فرمایا، اور مذکورہ بالا حدیث میں یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ ذکر نہیں کی گئی کہ آیا یہ قاعدہ صرف انہی چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا یہ کچھ اور چیزوں پر بھی لاگو ہوگا؟ اور اگر مؤخر الذکر صورت ہے تو پھر

ان کے علاوہ اشیاء کون سی ہوں گی؟ اس سوال پر مسلّم فقہائے کرامؒ کے درمیان اختلاف ہوا، ابتدائی دور کے بعض فقہاء مثلاً قتادہؒ اور طاؤسؒ نے صرف ان چھ چیزوں تک ہی اس حکم کو منحصر رکھا، تاہم دُوسرے فقہاء نے اس حکم کو اسی قسم کی دُوسری چیزوں پر بھی لاگو کیا، اس موقع پر ان فقہاء کے درمیان اختلاف پیدا ہوا کہ ان چھ اشیاء کے درمیان کون سی قدرِ مشترک کو رِبا الفضل قرار دیئے جانے کی علت قرار دیا جائے؟ امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کا خیال تھا کہ ان چھ چیزوں کے درمیان قدرِ مشترک یہ بات ہے کہ یہ اشیاء تول کر یا کسی برتن سے ناپ کر بیچی جاتی ہیں، چنانچہ ان کے علاوہ کوئی اور چیز بھی اگر وزنی یا پیمائشی ہو اور اسے اسی جنس کے ذریعے فروخت کیا جائے تو اس کا بھی بالکل یہی حکم ہوگا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان چھ چیزوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ یہ یا تو کھانے کے قابل ہیں یا تبادلے کا ذریعہ بننے کے قابل ہیں۔ گندم، جو، کھجور اور نمک کھانے کے قابل اشیاء ہیں، جبکہ سونا اور چاندی سب جگہ زرِ قانونی سمجھے جاتے ہیں، اسی لئے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تمام کھانے کے قابل اشیاء اور عالمگیر زرِ قانونی کا حکم وہی ہوگا جو سابقہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ان چھ اشیاء میں مشترک خصوصیت یہ ہے کہ یہ یا تو غذائی اشیاء ہیں یا قابلِ ذخیرہ ہیں، اسی لئے ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ تمام اشیاء جو غذائی ہوں یا انہیں ذخیرہ کیا جاسکے تو ان کا بھی یہی حکم ہوگا۔

۶۱:- مسلمان فقہاء کے اس اختلافِ آراء کا سبب یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ چھ اشیاء کا حکم بیان کرنے کے بعد یہ نہیں فرمایا کہ آیا ان کے علاوہ بھی کچھ اور اشیاء اسی حکم کے تابع ہوں گی یا نہیں؟

حضرت عمرؓ کے ارشاد کا صحیح مطلب

۶۲:- یہ تھا وہ پسِ منظر جس کے تحت حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ حضور صلی

اللہ علیہ وسلم اس سے قبل کہ اس رائے کے اختلاف کی بابت کچھ راہ نمائی فرماتے، انتقال فرما گئے، حضرت عمرؓ کے بیان کے گہرے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ صرف اس ربا الفضل کے بارے میں متردّد تھے، جسے پیچھے حدیث میں بیان کیا گیا ہے، نہ کہ اس اصل ربا القرآن کے بارے میں، جسے قرآن نے حرام قرار دیا تھا، اور اسے جاہلیت کے عرب اپنے قرضوں اور بارٹر کے سوا دُوسری خرید و فروخت کے معاملات میں استعمال کیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں ذکر کردہ حضرت عمرؓ کے ارشاد کی ایک معتبر ترین روایت سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے، بخاری کی روایت کے الفاظ درج ذیل ہیں:-

ثلاث وددت ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يفارقنا حتّٰى يعهد الينا عهدًا: الجد والكلالة، وأبواب من أبواب الربا.

ترجمہ:- تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں میری یہ خواہش تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تفصیل بیان کرنے سے قبل ہم سے جدا نہ ہوتے، وہ چیزیں یہ ہیں: دادا کی وراثت کا مسئلہ، کلالہ کی میراث کا مسئلہ (وہ شخص جس نے نہ باپ اور نہ بیٹا چھوڑا ہو) اور ربا کے کچھ مسائل۔

۶۳:- مزید براں ایک اور موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنا مطلب مذکورہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:-

انكم تزعمون انا لا نعلم أبواب الربا، ولأن أكون أعلمها أحب الي من أن يكون لي مصر وكورها، ومن الأمور لا يكن يخفين على أحد، هو: ان يبتاع الذهب بالورق نسيئًا وان يبتاع الثمرة وهي معصفرة لم تطب.

ترجمہ:- تم سوچتے ہو کہ ہم رِبا کے مسئلے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے اس کے مسائل جاننا اس بات سے بھی زیادہ پسند ہے کہ میں کسی ملک مثلاً مصر اور اس کے مضافات کا مالک بن جاؤں، تاہم رِبا کے بارے میں بہت سے ایسے مسائل ہیں کہ جن سے کوئی شخص بے خبر نہیں ہوسکتا، مثلاً سونے کا چاندی کے ذریعہ تبادلہ اُدھار پر، اور پھلوں کو درختوں پر اس حال میں خریدنا جب کہ وہ پیلے ہوں اور کاٹے نہ گئے ہوں (اور ان کا تبادلہ اس جنس کے دُوسرے پھلوں کے بغیر وزن کے کیا جائے)۔

۶۴:- حضرت عمرؓ کے ارشاد کی یہ دو روایتیں واضح طریقے سے دو باتوں کا پتہ دیتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ ان کی تمام توجہ اس رِبا سے متعلق ہے جو ''رِبا الفضل'' کہلاتا ہے، نہ کہ وہ ''رِبا النسیئۃ'' جسے قرآنِ کریم نے حرام قرار دیا تھا۔ اور دُوسری بات یہ کہ وہ رِبا الفضل کے مسئلے میں بھی بہت سے معاملات میں کسی قسم کی مشکلات محسوس نہ فرماتے تھے، بلکہ وہ تو صرف ان چند معاملات سے متعلق متردّد تھے جو کہ متعلقہ حدیث یا کسی اور حدیث میں واضح طور پر مذکور نہ تھے۔

۶۵:- مذکورہ بالا تفصیل پر ایک اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ ابنِ ماجہ کی ایک روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رِبا کی آیت قرآنِ کریم کی نازل شدہ آخر ترین آیات میں سے ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی وضاحت فرمانے سے پیشتر ہی انتقال فرماگئے، یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے شبہات اسی رِبا کے بارے میں تھے جو قرآنِ کریم کا حرام کردہ ہے، نہ کہ رِبا الفضل کے بارے میں۔ لیکن اس ارشاد کو روایت کرنے والے متعدّد ذرائع کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ابنِ ماجہ والی روایت اتنی زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہے، جتنی کہ بخاری اور مسلم کی

روایت ہے، ابنِ ماجہ کی روایت میں ایک راوی سعید بن ابی عروبہ ہیں جن کے بارے میں ماہرینِ حدیث کی رائے یہ ہے کہ یہ صاحب بعض اوقات ایک روایت کو دُوسری روایت کے ساتھ اُلجھا دیا (Confuse) کرتے تھے۔ ہم پہلے ہی بخاری اور مسلم کی روایتیں معتمد ترین راویوں کی سند کے ساتھ ذکر کر چکے ہیں، ان میں سے کسی نے حضرت عمرؓ کی طرف یہ بات منسوب نہیں کی کہ آیتِ رِبا قرآنِ کریم کی آخری ترین آیات میں سے ہے، ایسا لگتا ہے کہ کوئی ایک راوی مثلاً ابنِ ابی عروبہ نے حضرت عمرؓ کے اصل الفاظ کو حضرت ابنِ عباسؓ کے الفاظ یا ان کی رائے (جسے پیچھے بھی ذکر کیا گیا ہے) کے ساتھ مخلوط کر دیا ہوگا، ہم پیچھے بہت تفصیل سے یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ اس بات کو ماننا صحیح نہیں ہے کہ رِبا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دورِ حیات میں ممنوع قرار دیا گیا تھا، اور رِبا کی آیات قرآنِ کریم کی آخری نازل شدہ آیات میں سے ہیں، لہٰذا حضرت عمرؓ کی روایت کا صحیح مفہوم سمجھ لینے کے بعد ابنِ ماجہ کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ مذکورہ بالا بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے شبہات صرف ''رِبا الفضل'' کی حرمت سے متعلق تھے، جہاں تک ''رِبا القرآن'' یا ''رِبا النسیئۃ'' کا تعلق ہے، ان کو اس کی حقیقت کے بارے میں ذرّہ برابر بھی شبہ نہ تھا۔

پیداواری یا صَرفی قرضے

۶۶:- بعض اپیل کنندگان کی طرف سے ایک اور دلیل یہ بھی دی گئی کہ قرآنِ کریم نے صرف صَرفی قرضوں کے اُوپر کسی اضافی رقم کے مطالبے کو منع کیا ہے، جس میں مقروض ایسے غریب لوگ ہوتے تھے جو اپنی روزمرہ کی غذائی یا لباس پوشاک وغیرہ سے متعلق ضروریات کی تکمیل کے لئے قرضے لیا کرتے تھے، چونکہ اس زمانے میں کسی قسم کے پیداواری قرضے نہیں ہوتے تھے، اس لئے قرآنِ پاک نے پیداواری یا تجارتی قرضوں پر عائد کیا جانے والا اضافہ حرام قرار نہیں دیا۔ مزید براں انہوں نے

یہ دلیل بھی دی کہ کسی غریب شخص سے کسی قسم کی اضافی رقم وصول کرنا ناانصافی ہے، تاہم کسی امیر شخص سے جو اپنی تجارت چمکانے اور نفع کمانے کے لئے قرضہ لیتا ہے اس سے اضافی رقم وصول کرنا ناانصافی نہیں ہے، لہٰذا صرف پہلی قسم کے قرضے یعنی صَرفی قرضوں پر وصول کیا جانے والا اضافہ ''رِبا'' کہلائے گا، اس کے برعکس تجارتی قرضوں پر اضافی رقم رِبا نہیں ہوگی۔

۶۷:- ہم نے اس دلیل پر خوب غور وفکر کیا، لیکن یہ دلیل درج ذیل تین وجوہات سے قابلِ التفات نہیں رہتی۔

کسی معاملے کی دُرستگی کا معیار کسی فریق کی مالی حیثیت نہیں ہوتی

۶۸:- پہلی بات یہ ہے کہ کسی مالیاتی، تجارتی معاملے کی دُرستگی کی بنیاد کسی بھی پارٹی یا فریق کی مالی حیثیت ہرگز نہیں ہوتی، بلکہ درحقیقت اس معاملے کی دُرستگی کی بنیاد اس عقد کی حقیقی ماہیت ہوتی ہے، اگر کوئی عقد اپنی ماہیت کے لحاظ سے دُرست ہے تو پھر فریقین میں سے کسی کے غریب یا امیر ہونے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا، خریدار خواہ مال دار ہو یا غریب، وہ معاملہ دُرست قرار پائے گا۔ مثلاً بیع ایک جائز معاملہ ہے، جس کے ذریعے حلال منافع حاصل کیا جاتا ہے، اور یہ معاملہ بہرصورت جائز ہے، خواہ خریدار امیر ہو یا غریب۔ کرایہ داری ایک قانونی اور جائز معاملہ ہے، خواہ اس کا کرایہ دار غریب شخص ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ غریب خریدار یا غریب کرایہ دار انسانی بنیادوں پر رعایت کا مستحق ہوگا، لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ اس سے سرے سے نفع لینا ہی ممنوع وحرام ہے۔ اگر کوئی غریب آدمی کسی نانبائی سے روٹی خریدتا ہے تو کوئی شخص یہ تو کہہ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ نفع نہ کماؤ، لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ نانبائی کو اسے روٹی صرف لاگت پر فروخت کرنی چاہئے، اور اس پر کسی قسم کا نفع کمانا دوزخ میں لے جانے والا گناہ ہے۔ اگر کوئی غریب شخص

کوئی ٹیکسی کرایہ پر لیتا ہے تو ایک شخص اس کے مالک سے یہ تو کہہ سکتا ہے کہ تم اس کی غربت کی وجہ سے اس سے کرایہ کم لو، لیکن اس سے کوئی شخص معقولیت کے ساتھ اس پر یہ اصرار نہیں کرسکتا کہ تم اس سے بالکل کرایہ نہ لو، یا اس سے اپنی لاگت اور خرچے سے زیادہ وصول نہ کرو، ورنہ تمہاری کمائی حرام اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کے مترادف ہوگی۔ نانبائی نے اپنی دُکان اس لئے کھولی تھی تاکہ وہ اس میں جائز تجارت کے ذریعے اپنی محنت اور سرمایہ داری کی وجہ سے مناسب نفع کا مستحق ہو، خواہ اس کا خریدار غریب ہو، اب اگر اس کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ تم غریب لوگوں کو روٹیاں لاگت پر فروخت کرو، تو وہ نہ تو اپنی دُکان چلاسکتا ہے، اور نہ ہی وہ اپنے بچوں کے لئے روزینہ کماسکتا ہے، اسی طرح ٹیکسی چلانے والا مسافروں کے واسطے اپنی ٹیکسی چلانے کی خدمت کے عوض ان سے مناسب کرایہ بھی وصول کرسکتا ہے، لہٰذا اگر اس سے یہ کہا جائے کہ تم غریب لوگوں کے لئے یہ خدمت مفت فراہم کرو، تو وہ یہ کام کرہی نہیں سکتا۔ لہٰذا کبھی کسی شخص نے بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ کسی غریب سے کوئی نفع، اُجرت یا کرایہ کمانا مکمل طور پر حرام ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی دُرست معاملے میں جائز نفع کمانا یا ایسے افراد سے جو کسی خدمت کے ذریعہ نفع اُٹھائیں ان سے اُجرت یا کرایہ وصول کرنا جائز ہے، اگرچہ وہ غریب ہوں۔

۶۹:- دُوسری طرف ممنوعہ معاملات کے ممنوع ہونے کی وجہ اس معاملے کی حقیقی ماہیت ہے، نہ کہ کسی فریق کی مالی حیثیت۔ قمار یا جوا، مال دار یا غریب دونوں کے لئے حرام ہے، رشوت حرام ہے خواہ کسی مال دار سے لی جائے یا غریب سے، خلاصہ یہ ہے کہ مال داری یا غربت ایسے وصف نہیں ہیں جو کسی معاملے کی دُرستگی یا نادُرستگی کی بنیاد بنیں، بلکہ اس معاملے کی بنیادی شرائط اس کی صحت وفساد کا سبب ہوتی ہیں۔

۷۰:- کسی مقروض سے انٹرسٹ وصول کرنے کا معاملہ بھی اس سے چنداں مختلف نہیں ہے، چنانچہ اگر یہ بنیادی طور پر ایک جائز معاملہ ہے تو خواہ مقروض غریب

ہو یا امیر بہرصورت جائز ہونا چاہئے، اور اگر یہ بنیادی طور پر ناجائز ہے تو بھی غربت اور مال داری کا لحاظ رکھے بغیر اسے ناجائز ہونا چاہئے، یہاں پر انٹرسٹ کے عقد اور خرید وفروخت کے عقد میں اس طرح کی تفریق کرنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ مذکورۃ الصدر کی دُرستگی صرف مال دار مقروضوں تک محدود ہو، جبکہ خرید وفروخت کے عقد میں غریب اور امیر دونوں سے مساوی طور پر نفع کمانا جائز ہو۔ درحقیقت یہ اندازِ فکر کہ انٹرسٹ صرف اس صورت میں حرام ہے جبکہ کسی غریب سے وصول کیا جائے، تجارت کے اس مسلّم اُصول کے سرے سے خلاف ہے کہ جس میں کسی معاملے کی صحت کو خود اس معاملے کی حقیقت اور پختگی کے پیمانے سے جانچا جاتا ہے، نہ کہ اس سے متعلق فریقوں کی مالی حیثیت کے پیمانے سے۔

۷۱:- مزید براں غربت ایک اضافی (Relative) اصطلاح ہے، جو کہ مختلف مراتب رکھتی ہے، اگر ایک مرتبہ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ انٹرسٹ صرف غریب سے وصول نہیں کیا جائے گا، تاہم مال دار سے وصول کرنا بالکل حق بجانب ہوگا، تو پھر وہ کون سی مجاز اتھارٹی ہوگی جو غربت جانچنے کے لئے ایک ایسا پیمانہ مقرّر کرے کہ جس کی وجہ سے کسی غریب کو انٹرسٹ کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا جاسکے، پھر اگر جائز یا ناجائز انٹرسٹ کی بنیاد قرض لینے کے مقاصد کو قرار دیا جائے یعنی ذاتی احتیاج سے متعلق قرضوں پر انٹرسٹ کی ادائیگی کو مستثنیٰ قرار دیا جائے، جیسا کہ بعض اپیل کنندگان کا یہی موقف تھا، تو پھر احتیاج کے بھی بذاتِ خود کئی مراتب اور حدود ہیں، احتیاج کی حد غذائی اجناس سے شروع ہوکر (پُرتعیش) اشیاء تک جا پہنچتی ہے، اگر احتیاج یا صَرف کو کسی کی زندگی کی ضروریات تک ہی محدود کردیا جائے تب بھی یہ آدمی آدمی میں بدل سکتی ہے، ایک شخص یہ دلیل دے سکتا ہے کہ ذاتی ٹرانسپورٹ اب زندگی کی ضرورت بن چکی ہے، لہٰذا کار خریدنے کے لئے بلاسود قرضے جائز ہونے چاہئیں، مکان بھی انسان کی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے، لہٰذا کسی بھی مکان کے لئے لاکھوں روپے

کے قرضوں پر بھی انٹرسٹ عائد نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ یہ تمام ضروریات ''احتیاجی قرضوں'' کی فہرست میں داخل ہیں، اس کے برخلاف اگر ایک بیروزگار شخص چند ہزار روپے اس لئے قرض لے تاکہ سڑک پر ایک ٹھلّہ لگا کر کاروبار شروع کرے تو اس پر سود عائد کرنا اس فلسفے کے تحت جائز ہونا چاہئے، کیونکہ یہ تجارتی قرضہ ہے نہ کہ صَرفی قرضہ۔

۷۲:- اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انٹرسٹ کا جواز نہ تو مقروض کی مالی حیثیت پر مبنی ہے اور نہ ہی روپیہ قرض لینے کے مقصد پر مبنی ہے، لہٰذا اس لحاظ سے صَرفی اور پیداواری قرضوں میں امتیاز یا تفریق کرنا مُسلَّمہ اُصولوں کے خلاف ہے۔

قرآنی ممانعت کی حقیقت

۷۳:- دُوسری بات جس کی وجہ سے یہ دلیل قابلِ قبول نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ نہ تو رِبا کو حرام قرار دینے والی آیات صَرفی اور تجارتی قرضوں کے رِبا میں کوئی تفریق کرتی ہیں، اور نہ رِبا سے متعلق احادیث میں اس قسم کا کوئی فرق نظر آتا ہے، یہاں تک کہ اگر بالفرض تھوڑی دیر کے لئے یہ بات تسلیم بھی کرلی جائے کہ اس زمانے میں تجارتی قرضے نہیں پائے جاتے تھے، تب بھی اس بات کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا کہ رِبا کا جو تصوّر قرآنِ کریم کے مخاطب حضرات کے ذہن میں بالکل واضح تھا، اس میں کوئی خارجی شرط عائد کی جائے۔ قرآنِ پاک نے تو رِبا کو علی الاطلاق حرام قرار دیا ہے، خواہ رِبا کی کوئی شکل اس کے نزول کے وقت رائج ہو یا نہ ہو۔ جب قرآنِ پاک کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی حرمت سے مراد اس معاملے کی کوئی ایک مخصوص شکل نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس معاملے کا بنیادی تصوّر ہوتا ہے جو اس حکم کے ذریعہ متأثر ہوتا ہے، جب شراب حرام کی گئی تھی تو اس سے شراب کی صرف وہ شکلیں مراد نہ تھیں جو عہدِ رسالتؐ میں رائج تھیں، بلکہ اس شراب کی بُنیادی حقیقت کو حرام کیا گیا تھا، لہٰذا

کوئی بھی معقول شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ شراب کی کوئی ایسی شکل جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مروّج نہ تھی، حرام نہیں ہے۔ جب قمار یا جوئے کی حرمت کا اعلان کیا گیا، تو اس کی حرمت کا مقصد صرف اس زمانے میں رائج قمار کی صورتوں تک محدود نہ تھا، بلکہ درحقیقت اس کی ممانعت اس کی تمام موجودہ اور آئندہ شکلوں پر محیط تھی، اور کوئی بھی یہ عقلی توجیہ نہیں کرسکتا کہ جوئے (Gambling) کی جدید صورتیں اس ممانعت کے حکم کے تحت نہیں آتیں۔ ہم پہلے بھی یہ بات ذکر کر چکے ہیں کہ رِبا کے جو معنیٰ اہلِ عرب کے سمجھ میں آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرامؓ نے بھی بیان فرمائے وہ یہ تھے کہ قرض یا دَین کے معاملے پر کوئی بھی مقرر کردہ اضافی رقم رِبا ہے، رِبا کا یہ تصور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت سی شکلیں رکھتا تھا، اور بعد میں آنے والے زمانوں میں اس کی شکلوں میں مزید اضافہ ہوا ہوگا، اور مستقبل میں بھی اس کی شکلوں میں اضافہ متوقع ہے، لیکن جب تک مذکورہ بالا رِبا کا بنیادی عنصر اس معاملے میں موجود رہے گا، رِبا کی وہ شکل یقیناً حرام رہے گی۔

عہدِ قدیم میں بینکاری اور پیداواری قرضے

۷۴:- تیسرے یہ کہ یہ بات کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ تجارتی یا پیداواری قرضے اس زمانے میں جبکہ رِبا حرام قرار دیا گیا رائج نہ تھے، اس بات کو ثابت کرنے کے لئے بہت وافر مواد ریکارڈ پر آچکا ہے کہ تجارتی یا پیداواری قرضے اہلِ عرب کے لئے اجنبی نہ تھے، اور پیداواری اور تجارتی مقاصد کے لئے قرضے اسلام کے ظہور سے پہلے اور بعد دونوں زمانوں میں رائج تھے۔

۷۵:- حقیقت یہ ہے کہ علمی اور تاریخی ریسرچ نے اس تأثر کی غلطی پورے طور پر بے نقاب کردی ہے کہ تجارتی اور بینکاری معاملات درحقیقت سترہویں صدی عیسوی کی ایجاد ہیں، عہدِ جدید کی تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ بینکاری معاملات کی

تاریخ کم از کم دو ہزار سال قبل مسیح پرانی ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے بینکوں کی تاریخ پر بحث کے دوران تفصیل سے بینکاری کی ابتداء کی مثالیں بیان کی ہیں، اس کا متعلقہ مضمون درج ذیل عبارت سے شروع ہوتا ہے:-

گزشتہ اقوام مثلاً عبرانیوں نے جب سرمایہ قرض دینا شروع کیا، اس زمانے میں وہ ایسا کوئی بینکاری کا نظام نہیں رکھتے تھے جسے جدید نقطۂ نگاہ سے مکمل کہا جاسکے، لیکن ۲۰۰۰ق م کی ابتداء سے بابل کے رہنے والوں نے اس طرح کا ایک نظام تیار کرلیا تھا۔ یہ کسی انفرادی یا ذاتی تحریک کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ یہ مال دار اور منظم مذہبی اداروں کی طرف سے ادا کی جانے والی ضمنی خدمت تھی، بابل کے عبادت خانے مصر کے عبادت خانوں کی طرح بینک بھی تھے، بابل کی ایک دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ چاندی کے سکے (Shekels) کواڈاڈری مِنی کے بیٹے ماس شماخ نے وارڈاین ہل کی بیٹی سورج پرست امت شماخ سے قرضے کے طور پر لئے تھے، وہ سورج دیوتا کا سود ادا کرے گا، فصل کی کٹائی کے وقت وہ اصل بمع سود ادا کرے گا۔ یہ بات محقق ہوچکی ہے کہ سورج پرست امت شماخ اس ادارے کی ہی مقرر کردہ وکیل تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چکنی مٹی کی تختیاں اپنے اُوپر کنداں تحریر کے ساتھ موجودہ دور کے قابلِ فروخت (Negotiable) تجارتی دستاویزات (Commercial Paper) کی مانند تھیں۔ ایک اور اس زمانے کی دستاویز اس قسم کی تھی کہ وہ بیان کرتی ہے کہ تاری بم کے بیٹے وارڈالی چ نے اباتم کی بیٹی سورج پرست التانی سے ایک چاندی کا سکہ (Shekel) سورج دیوتا کی جمع پونجی

(Balance) سے لیا، یہ رقم سرسوں کے بیج کی خریداری میں
استعمال ہونی تھی۔ سرسوں کی کٹائی کے وقت وہ اس کی اس وقت
کی قیمت پر یہ قرضہ سرسوں کی شکل میں اس سرٹیفکیٹ کے حامل
کو ادا کرے گا۔

۷۶:- اس مضمون نے یہ تفصیل بھی بیان کی ہے کہ کس طرح عملِ بینکاری
نے مذہبی اداروں سے ترقی پا کر ذاتی تجارتی ادارے (Private Business
Institute) کی شکل اختیار کی، یہاں تک کہ ۵۷۵ ق م میں بابل میں ایک بینکاری کا
ادارہ اے جیبی (Lgibi) کے نام سے قائم کیا گیا، اس بینک کا ریکارڈ یہ ظاہر کرتا ہے
کہ یہ بینک درج ذیل کام سرانجام دیتا تھا، اپنے گاہک کے وکیل کے طور پر خریداری
کرنا، فصلوں پر قرضے دینا، ادائیگی کو یقینی بنانے کے لئے فصلوں کو پیشگی رہن رکھنا،
دستخطوں اور گروی رکھ کر قرضے دینا، اور سود پر کھاتے کھولنا وغیرہ۔

یہ مضمون مزید تفصیل بیان کرتا ہے کہ اس قسم کے بینکاری کے ادارے
یونان، روم، مصر وغیرہ میں حضرت عیسٰی علیہ السلام سے صدیوں قبل قائم کئے گئے تھے،
اور وہ رقوم جمع (Deposit) کرتے، ان کو سودی قرضے پر دیتے، اور بڑی مقدار میں
لیٹرز آف کریڈٹ (L.C)، مالیاتی دستاویزات (Certificates) تجارت میں استعمال
کرتے تھے۔

۷۷:- ماضیٔ قریب کا ایک مشہور مؤرخ وِل دورانت نے ان بینکاری کے
معاملات کی تفصیل بیان کی ہے جو پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان کے اندر رائج تھے،
انہوں نے ذکر کیا ہے کہ سود پر پیسے جمع کرانے پر اگرچہ اس زمانے کے فلسفیوں نے
بہت تنقید کی، لیکن پھر بھی یونان میں بینک قائم ہوگئے:-

کچھ لوگ اپنے پیسے عبادت خانوں کے خزانے میں جمع کراتے
تھے، وہ عبادت خانے بینک کی طرح خدمت سرانجام دیتے تھے،

اور وہ متوسط ریٹ آف انٹرسٹ (شرحِ سود) پر افراد اور ریاستوں کو قرضے دیتے تھے، ڈیلفی میں اپولو نام کا عبادت خانہ کسی حد تک پورے یونان کا ایک بین الاقوامی بینک تھا۔ کوئی شخص ذاتی طور پر گورنمنٹ (حکومت) کو قرضے نہیں دیتا تھا، تاہم ایک ریاست دُوسری ریاست کو قرضے دیا کرتی تھی، جبکہ صرافوں (Money Changer's) نے پانچویں صدی عیسوی میں اپنی میز پر لوگوں کے پیسے ڈیپازٹ رکھنے شروع کئے، اور پھر تاجروں کو اپنے رِسک کے حساب سے ۱۲ تا ۳۰ فیصد کی شرحِ سود پر قرضے دینا شروع کیا، اس طرح وہ بینکر بنتے چلے گئے، اگرچہ وہ اسے یونان کے عہدِ قدیم کی انتہاء تک (بجائے لفظ بینک کے) (Trapezite) ٹرے پی زٹ کہتے رہے، جس کا مطلب میز کا آدمی ہے، اس نے اپنا یہ طریقہ درحقیقت مشرقِ قریب سے لے کر اور اسے ترقی دے کر رُوم (اٹلی) میں منتقل کیا، جو کہ بعد میں منتقل ہوتے ہوتے جدید یورپ تک پہنچ گیا۔

ایرانی جنگ کے متصل بعد تھیمس ٹوکلس نے کورینتھیا کے بینکر فلاسٹیفینوس کے پاس سترٹیلنٹس (جو چار لاکھ بیس ہزار ڈالر کے مساوی تھے) ڈیپازٹ کے طور پر رکھوائے، اور اس کا یہ عمل بڑی حد تک ان سیاسی مہم جو لوگوں کے طریقۂ کار کے مشابہ تھا جو ہمارے دور میں غیرملکوں میں اپنے آشیانے بنا کر رکھتے ہیں، یہ معاملہ غیرمذہبی بینکنگ کی سب سے پہلی معلوم مثال ہے، اسی صدی کے اختتام پر اینٹی اسٹھینس اور آرچسٹس نے وہ ادارہ قائم کیا جو یونان کے پرائیویٹ بینکوں میں سب سے زیادہ مشہور

ثابت ہوا، قدیم بینکاری کے روپے کی اس تیز رفتار اور آزادانہ گردش نے پہلے سے کہیں زیادہ تخلیقی انداز میں ایتھنز کی تجارت کو وسعت بخشی۔

۷۸:- عرب میں بھی اسلام کے ظہور سے قریبی زمانے میں تجارتی، صنعتی اور زرعی قرضے سودی بنیاد پر شام کی بازنطینی حکومت میں اتنے زیادہ عام تھے کہ ایک بازنطینی حاکم جسٹینین (Justinian) (۵۶۵ - ۵۲۷) کو مختلف قسم کے مقروضوں کے لئے ریٹ آف انٹرسٹ (شرح سود) کی تعیین کے لئے باقاعدہ ایک قانون نافذ کرنا پڑا۔ گبن (Gibbon) نے جسٹینین کے اس قانون کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے کہ وہ قانون انتہائی ممتاز لوگوں سے ۴ فیصد، عام لوگوں سے ۶ فیصد، تاجروں اور صنعت کاروں سے ۸ فیصد اور بحری انشورنس کرنے والوں کو ۱۲ فیصد تک کے حساب سے سود لینے کی اجازت دیتا تھا، گبن کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

> Persons of illustrious rank were confined to the moderate profit of four percent; six was pronounced to be the ordinary and legal standard of interest; eight was allowed for the convenience of manufacturers and merchants; twelve was granted to nautical insurance.[1]

ترجمہ:- اعلیٰ ترین عہدوں کے لوگوں سے متوسط نفع ۴ فیصد تک، ۶ فیصد عام لوگوں کے لئے متوسط قانونی ریٹ قرار دیا گیا، ۸ فیصد صنعت کاروں اور تاجروں کے لئے مقرر کیا گیا، اور ۱۲ فیصد بحری انشورنس کرانے والوں کے لئے متعین کیا گیا۔

۷۹:- مندرجہ بالا پیراگراف کے تحت السطور یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ

(1) Gibbon: The Decline and fall of the Roman Empire, chapter 44, The Institute iv. 2p 90.

حکومتِ رُومان میں تجارتی سود اتنا زیادہ پھیل چکا تھا کہ ان کے ریٹ آف انٹرسٹ کو معین کرنے کے لئے ایک مستقل قانون نافذ کرنا پڑا۔

جسٹینین کا یہ قانون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے کچھ عرصہ قبل ہی بازنطینی حکومت میں نافذ العمل ہوا تھا، کیونکہ جسٹینین کی وفات ۵۶۵ء میں ہوئی، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ۵۷۰ء میں ہوئی، اور یہ بات ظاہر ہے کہ وہ قانون اپنے نفاذ کے وقت سے لے کر کافی عرصے تک مؤثر رہا۔ دُوسری طرف اہلِ عرب خصوصاً اہلِ مکہ کافی عرصے سے بازنطینی حکومت کے انتہائی تہذیب یافتہ صوبوں میں سے ایک صوبہ شام کے ساتھ تجارتی تعلقات برقرار رکھے ہوئے تھے، ابھی ہم آگے تفصیل کے ساتھ ملاحظہ کریں گے کہ اہلِ عرب کے تجارتی قافلے شام کے ساتھ درآمد و برآمد کی تجارت کیا کرتے تھے۔ بازنطینی سلطنت کے ساتھ ان کے معاشی اور مالیاتی تعلقات اس قدر نمایاں تھے کہ پورے جزیرہ نمائے عرب میں جو کرنسی استعمال ہوتی تھی وہ بازنطینی حکومت کے بنائے ہوئے (چاندی کے) درہم اور (سونے کے) دینار تھے، یہاں تک کہ شاعروں نے دینار کو قیصری کے نام سے پکارا ہے، عرب کے مشہور شاعروں میں سے ایک کُثیر عَزّہ نے کہا ہے کہ:-

یروق عیون الناظرات کانہ

ھرقلیّ وزن احمر التبر راجح

ترجمہ:- دیکھنے والوں کی نگاہوں کو وہ اتنا پسند آتا ہے، جیسے سرخ سونے کا ڈھلا ہوا شاہِ رُوم ہرقل کے مقرّر کردہ وزن کا دینار۔

۸۰:- ابن العنبری نے ایک شاعر کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ:-

دنانیر مما شیف فی ارض قیصر

وہ دینار جو قیصر کی زمین میں چمکائے جاتے تھے۔

۸۱:- مزید یہ کہ بعض معاصر لکھنے والوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ عرب سکوں

کے نام درہم، دینار اور فلس دراصل یونانی یا لاطینی الفاظ سے ماخوذ ہیں، جو کہ ان ناموں سے کافی ملتے جلتے ہیں، یہ بازنطینی سکے پورے عالمِ اسلام میں ٧٦ھ تک استعمال میں رہے، یہاں تک کہ اس کے بعد عبدالملک بن مروان نے اپنے دینار بنانے شروع کیے۔

۸۲:- اہلِ عرب کے رُومیوں کے ساتھ اتنے قریبی مالیاتی معاملات کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ تصور کیسے کیا جاتا ہے کہ اہلِ عرب رُومی حکومت میں رائج شدہ قرض کے معاملات سے بالکل بے خبر تھے؟ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، عرب کے تجارتی تعلقات صرف شام تک محدود نہیں تھے، بلکہ وہ عراق، مصر اور ایتھوپیا (حبشہ) تک پھیلے ہوئے تھے، وہ ان ممالک کے تجارتی انداز اور طریقۂ کار سے بخوبی واقف تھے، اہلِ عرب ان ممالک کے سودی معاملات سے کس قدر آگاہ تھے، اس کا اندازہ مدینہ کے معروف صحابی حضرت عبداللہ بن سلامؓ کی ایک نصیحت سے ہوتا ہے جو انہوں نے ابوبردہؒ کو کی تھی، ابوبردہؒ جو عراق کی طرف ہجرت کر گئے تھے اور مدینہ میں زیارت کی غرض سے آئے تھے، عبداللہ بن سلامؓ نے ان کو خبردار کیا کہ وہ ایسے ملک میں رہتے ہیں کہ جہاں رِبا بہت پھیلا ہوا ہے، لہٰذا انہیں لوگوں کے ساتھ معاملات کرتے وقت خوب محتاط رہنا چاہئے کہ کہیں وہ بے خبری میں رِبا میں ملوّث نہ ہوجائیں، بالکل یہی نصیحت حضرت اُبَیّ بن کعبؓ نے اپنے شاگرد زرّ بن حُبیشؒ سے کی۔

عرب میں تجارتی سود

۸۳:- اب خود جزیرہ نمائے عرب کی طرف آجائیے، اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ تجارت، عرب کی انتہائی اہم معاشی سرگرمی تھی، خصوصاً مکہ مکرمہ چونکہ بنجر زمینوں اور پہاڑی علاقوں پر مشتمل ہے، اس لئے وہ زراعت کے لئے بالکل

نامناسب تھا، اس وجہ سے اہلِ مکہ کی اقتصادی زندگی کا تمام تر محور تجارت تھی، اور ان کی تجارت کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ صرف عرب تک محدود نہ تھی، بلکہ ان کا اصل کاروبار ہی اپنی اشیاء کو دُوسرے ممالک کو برآمد کرنا، اور ان کی اشیاء اپنے یہاں درآمد کرنا تھا۔ اس مقصد کے لئے ان کے تجارتی قافلے شام، عراق، مصر اور ایتھوپیا وغیرہ جاتے تھے، ان تجارتی قافلوں کی تاریخ حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے تک جاملتی ہے، یہ بات قرآنِ کریم میں مذکور ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے ایک کنویں میں ڈال دیا تھا، جہاں سے ایک قافلہ ان کو نکال کر مصر لے گیا اور وہاں انہیں فروخت کردیا، اس بات کی تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ یہ تجارتی قافلہ ایک عرب قافلہ تھا جس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد بھی شامل تھی، جو کہ ایک تجارتی سفر پر اشیاء برآمد کرنے کے لئے مصر جارہے تھے، اس حقیقت کا تذکرہ بائبل کے قدیم صحیفوں میں بھی اس طرح مذکور ہے:-

And they sat down to eat bread and they lifted up their eyes and looked and behold, a company of Ishmaelites came from Gilad with their camels bearing spicery and balm and myrrh going to carry it down to Egypt.(1)

ترجمہ:- اور وہ کھانا کھانے بیٹھے اور آنکھ اُٹھائی تو دیکھا کہ اسماعیلیوں کا ایک قافلہ جلعاد سے آرہا ہے اور گرم مصالحہ اور روغن بلسان اور مُرّ اُونٹوں پر لادے ہوئے مصر کو لئے جارہا ہے۔

۸۴:- یہ عرب قافلہ اتنے قدیم زمانے میں ہزاروں میل دُور ملکِ مصر کی طرف مصالحہ جات، بام (مرہم) اور خوشبویات وغیرہ برآمد کرنے جارہا تھا، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اہلِ عرب اپنی تاریخ کے بالکل آغاز سے اپنی جرأت مندانہ

(۱) بائبل کتاب پیدائش ۳۷:۲۵۔

تجارتی مہم جوئی کو کس حد تک بروئے کار لائے ہوئے تھے۔

۸۵:- چنانچہ بعد میں اہلِ عرب کی تجارتی سرگرمیاں خود بخود بڑھتی رہیں یہاں تک کہ ان کا تعارف ہی ایک تجارتی قوم کی حیثیت سے ہونے لگا، ظہورِ اسلام سے قبل ان کی تجارت کتنی پھیل چکی تھی؟ اس کا بہت سے مؤرخین نے تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور اس تمام تفصیل کے ذکر کا نہ تو یہاں موقع ہے اور نہ ہی ضروری ہے، لیکن اتنی حقیقت کا اعتراف سب لوگوں کو ہے جنہوں نے اہلِ عرب کی تاریخ کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے[1] کہ اہلِ عرب تجارتی ذہن رکھنے والے لوگ تھے، ان کے تجارتی قافلوں کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآنِ کریم نے پوری ایک سورت (سورۃ القریش) یہ بتلانے کے لئے نازل فرمائی کہ ان کا سردیوں میں یمن کی طرف اور گرمیوں میں شام کی طرف تجارت کرنا، درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کعبۃ اللہ کی خدمت کرنے کا صلہ اور انعام ہے، قرآنِ کریم نے خاص طور پر لفظ "اِیۡلَاف" کو ذکر فرمایا جو اُن تجارتی معاہدات سے عبارت ہے جو قریشی عربوں نے مختلف اقوام اور قبائل سے کئے ہوئے تھے،[2] ان قافلوں کے سائز کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر ابوسفیان کی قیادت میں جانے والا ایک قافلہ ایک ہزار اُونٹوں پر مشتمل تھا، اور اسے اس سفر میں سو فیصد (ہر دینار پر ایک دینار کا) نفع ہوا تھا۔[3]

۸۶:- یہ بات ظاہر ہے کہ اتنے بڑے قافلے کا تنہا کوئی ایک فرد مالک نہیں

---

(۱) ڈاکٹر جواد علی نے اپنی بہترین کتاب "المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام" میں تقریباً دو سو صفحات سے زائد (۲۲۷ تا ۴۴۴) ظہورِ اسلام سے قبل اہلِ عرب کی تجارتی زندگی کے تذکرے کے لئے وقف کردیئے ہیں۔

(۲) الزبیدی: تاج العروس ۶:۴۴۔

(۳) نہایۃ العرب ۱۷:۸۱، امتاع الاسماء ج:۱ ص:۷۵ قاہرہ ۱۹۸۱ء۔

ہوسکتا، بلکہ وہ پورے قبیلے کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ تھا، اور اس میں مشترک سرمایہ کی کمپنی (Joint Stock Company) کی مانند قبیلے کے ہر فرد نے سرمایہ کاری کی ہوئی تھی، مؤرخوں نے یہ بات تحریر کی ہے کہ:-

لم يبق قرشي ولا قرشية له مثقال الا بعث به في العير.

ترجمہ:- کوئی قریشی مرد اور عورت ایسا نہ بچا تھا کہ جس کے پاس ایک مثقال سونا ہو اور اس نے اس قافلے میں نہ لگایا ہو۔

۸۷:- اور یہ صرف ابوسفیان کے قافلے کی خصوصیت نہیں تھی کہ اس میں اس طرح سرمایہ کاری کی گئی تھی، بلکہ اس وقت ہر بڑے قافلے کو اسی انداز میں منظم کیا جاتا تھا۔

۸۸:- وہاں کی اس تجارتی فضا کو مدِنظر رکھتے ہوئے کوئی شخص یہ تصور نہیں کرسکتا کہ اہلِ عرب تجارتی قرضوں سے ناواقف تھے، اور ان کے قرضے صرف احتیاجی (Consumption) اور صَرفی مقاصد کے لئے ہوتے تھے، یہ بات محض ایک قیاس نہیں ہے، بلکہ اس بات کے قطعی ثبوت موجود ہیں کہ وہ اپنے تجارتی اور پیداواری مقاصد کے لئے بھی قرضے لیا کرتے تھے، ان میں سے چند ثبوت مختصراً ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر جواد علی جن کی جاہلیت کے عربوں کے بارے میں تفصیلی تحقیق پوری علمی دُنیا میں پذیرائی حاصل کرچکی ہے، اس میں انہوں نے ان قافلوں کے حصولِ سرمایہ کے ذرائع کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

ويظهر مما ذكره أهل الأخبار وأوردوه عن قوافل مكة ان مال القافلة لم يكن مال رجل واحد أو أسرة معينة بل كان يخص تجارًا من أسر مختلفة وأفرادًا وجد عندهم المال، أو اقترضوه من غيرهم فرموه في رأس مال

القافلة أملا في ربح كبير.

ترجمہ:- مکہ کے تجارتی قافلوں کے بارے میں تاریخ نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ یہ ہے کہ ان قافلوں کا سرمایہ کبھی کسی تنہا فرد کا نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ مختلف خاندانوں کے تاجروں سے تعلق رکھتا تھا، یا ایسے افراد جو بذاتِ خود مال دار تھے، یا انہوں نے دُوسروں سے سرمایہ قرض لیا تھا اور پھر اس سرمایہ کو ان قافلوں میں بڑے بڑے نفع کی اُمید پر لگادیا تھا۔

خط کشیدہ عبارت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان قافلوں کا سرمایہ تجارتی قرض وغیرہ سے بھی آتا تھا۔

ب:- تمام تفسیر کی کتابوں نے رِبا سے متعلق سورۂ بقرہ کی آیات کا پسِ منظر ذکر فرمایا ہے، تقریباً سب نے یہ ذکر کیا ہے کہ عرب کے مختلف قبائل ایک دُوسرے سے سود پر قرض لیا کرتے تھے، مثلاً ابنِ جریر الطبریؒ لکھتے ہیں:-

كانت بنو عمرو بن عوف يأخذون الرِبا من بني المغيرة، و كانت بنو المغيرة يربون لهم في الجاهلية۔ (1)

ترجمہ:- بنوعمرو کا قبیلہ بنومغیرہ سے سود لیا کرتا تھا، اور بنومغیرہ ان کو دورِ جاہلیت میں سود دیتے تھے۔

یہ قرضے کوئی فرد انفرادی طور پر ایک دُوسرے سے نہیں لیتا تھا، بلکہ ایک قبیلہ مجموعی طور پر ایک دُوسرے قبیلے سے قرضے لیتا تھا۔

ہم یہ بات پہلے ہی بیان کرچکے ہیں کہ عرب کے قبائل اپنے تجارتی قافلوں میں سرمایہ کاری اور اجتماعی تجارت کے لئے مشترک سرمایہ کی کمپنیوں کی طرح کام کیا کرتے تھے، اس لئے ایک قبیلہ کا دُوسرے قبیلے سے قرض لینا صرف احتیاجی یا صَرفی

(1) الطبری: جامع البیان ج:٣ ص:١٠٧۔

مقاصد کے لئے نہیں ہوسکتا، بلکہ درحقیقت وہ تجارتی قرضے تھے جن کا مقصد تجارتی مقاصد کی تکمیل تھی۔

ج:- سورۂ رُوم (۳۰:۳۹) کی وضاحت کے ذیل میں جس کا ذکر پیچھے اس فیصلے کے پیراگراف نمبر ۱۷ میں آچکا ہے، علامہ ابنِ جریر طبریؒ نے قرآنِ پاک کے قدیم مفسرین کا نقطۂ نظر بیان کیا ہے کہ یہ آیت دورِ جاہلیت کے ان افراد سے متعلق ہے جو دُوسروں کو اس غرض سے قرض دیتے تھے تاکہ مقروض کی دولت میں اضافہ ہو، علامہ ابنِ جریرؒ اپنے اس موقف کی حمایت میں حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ذکر فرماتے ہیں:-

الم تر الی الرجل یقول للرجل: لأمولنک فیعطیه، فھٰذا لا یربو عند الله لأنه یعطیه لغیر الله یثری به ماله. [1]

ترجمہ:- کیا تم نے ایک شخص کو دُوسرے سے یہ کہتے نہیں دیکھا کہ: میں تم کو ضرور تمویل (Finance) کروں گا، پھر وہ اس کو دے دیتا تھا، تو یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں نہیں بڑھتا، کیونکہ اس نے اس کو اللہ کی رضامندی کے واسطے نہیں دیا بلکہ مال میں اضافے کے لئے دیا ہے۔

انہوں نے اسی سیاق میں حضرت ابراہیم نخعیؒ کا مندرجہ ذیل جملہ بھی بیان فرمایا ہے:-

کان ھٰذا فی الجاھلیة یعطی أحدھم ذا القربة المال یکثر به ماله.

ترجمہ:- دورِ جاہلیت میں یہ تھا کہ کوئی ایک شخص اپنے کسی قرابت دار کو اس غرض سے مال دیتا تھا تاکہ اس کے مال میں اضافہ ہوجائے۔

---

(۱) الطبری: جامع البیان ج:۲۱ ص:۴۷۔

یہ بات ظاہر ہے کہ کسی شخص کو اس غرض سے تمویل کرنا کہ اس کے مال میں اضافہ ہوجائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مقروض اس مال کو آگے تجارت میں لگائے گا، اور اس سے نفع کمانے کے نتیجے میں اس کی دولت میں اضافہ ہوگا۔ حضرت ابنِ عباسؓ اور ابراہیم نخعیؒ کے مذکورہ دونوں اقوال سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عرب معاشرے میں پیداواری مقاصد کے لئے دیئے جانے والے قرضے اتنے عام تھے کہ اس سلسلے میں قرآنِ پاک کی سورۂ رُوم کی آیات نازل ہوئیں۔

د:- تجارتی سود کا تصوّر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں بھی ملتا ہے جو مسندِ احمد بن حنبل، البزار اور الطبرانی میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ سے منقول ہے، ان کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

> اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ایک مقروض کو بلائیں گے، وہ اللہ کے سامنے کھڑا ہوگا، اور اس سے پوچھا جائے گا: تم نے یہ قرض کیوں لیا؟ اور تم نے لوگوں کے حقوق پامال کیوں کئے؟ وہ کہے گا: اے میرے خدا! آپ جانتے ہیں کہ میں نے یہ قرضہ لیا تھا لیکن میں نے اسے نہ کھانے پینے میں، نہ کپڑے پہننے میں اور نہ ان کے بجائے کچھ کام کرنے میں استعمال کیا، بلکہ میں آگ یا چوری یا تجارتی نقصان کی تکلیف میں مبتلا ہوگیا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے بندے نے سچ بات کہی! میں ہی وہ بہترین ذات ہوں جو تمہاری طرف سے آج وہ قرضہ ادا کرے گی۔[1]

خط کشیدہ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شخص نے تجارتی مقصد کے لئے قرضہ لیا تھا، جس میں اس کو تجارتی نقصان ہوگیا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تجارتی

(۱) الھیثمی: مجمع الزوائد ج:۴ ص:۱۳۳۔

قرضے لینے کا تصور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں بالکل صاف اور واضح تھا۔

بخاری کی ایک قوی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اسرائیلی شخص کا واقعہ بیان فرمایا ہے کہ وہ ایک شخص سے ایک ہزار دینار قرض لینے کے بعد سمندری سفر پر روانہ ہوگیا،[۱] کچھ دُوسری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا یہ قرضہ تجارتی مقاصد کے لئے تھا۔[۲]

مزید یہ کہ اتنی بڑی مقدار کا قرضہ صرف ذاتی ضروریات کی تکمیل کے لئے نہیں ہوسکتا، اور اس حدیث میں اس کا بھی ذکر ہے کہ وہ قرضہ لینے کے بعد سمندری سفر پر روانہ ہوگیا، اس قرضے کی میعاد کے اختتام پر اس کو اتنا زیادہ نفع ہوا کہ اس نے ایک ہزار دینار اپنے قرض دینے والے کو بھیجے اور پھر اس نے ان کو دوبارہ ایک ہزار دینار اس خیال سے بھیجنے کی پیشکش کی کہ شاید انہیں پہلے ایک ہزار وصول نہیں ہوئے ہوں گے، لیکن قرض دینے والے نے یہ تسلیم کرلیا کہ میں نے وہ وصول کرلئے تھے، لہٰذا اس نے دوبارہ ایک ہزار دینار قبول کرنے سے انکار کردیا۔

یہاں پر ایک اور مثال ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود تجارتی قرضے کا تذکرہ فرمایا ہے۔

ھ:- مذکورہ بالا تجارتی قافلوں کے علاوہ کچھ دُوسری مثالیں ایسی بھی ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ تجارتی قرضے ذاتی حیثیت سے بھی لئے اور دیئے جاتے تھے، یہاں ذیل میں چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا ابولہب آپؐ کا سخت ترین مخالف اور دُشمن تھا، لیکن اس نے بذاتِ خود غزوۂ بدر میں شرکت نہیں کی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس

(۱) البخاری: کتاب:۳۹ حدیث:۲۲۹۱۔

(۲) فتح الباری ج:۴ ص:۴۷۱، امام بخاری نے یہ حدیث دُوسری جگہ پر بھی اس کے عنوان کے تحت لائی ہے، اور وہاں سمندر کے ذریعہ تجارت کا ذکر کیا ہے، کتاب:۳۴ باب:۱۰ حدیث:۲۰۶۳۔

نے ایک شخص عاصم بن ہشام کو ۴ ہزار درہم سودی قرضے پر دیئے تھے، اور جب وہ ان کی ادائیگی کرنے پر قادر نہ ہوا تو اس نے اپنے مقروض کو اس قرضے کے بدلے اس جنگ میں اپنا اجیر (غلام) بنا کر بھیج دیا، ظاہر ہے کہ اس زمانے میں چار ہزار درہم کی حیثیت ایک بھوکے آدمی کی ضرورت سے کہیں زیادہ تھی، لیکن درحقیقت اس نے یہ رقم تجارت کے لئے لی تھی، جو اس کے لئے نفع آور ثابت نہ ہوئی، بلکہ وہ دیوالیہ ہوگیا۔

(۲) حدیث اور تاریخ کی بہت سی کتابوں میں یہ بات مذکور ہے کہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مال دار ترین صحابہ کرامؓ میں سے تھے، ان پر اعتماد کی وجہ سے لوگ ان کے پاس بطور امانت پیسے رکھوانا چاہتے تھے، وہ ان تمام پیسوں کو بطور امانت رکھنے سے انکار کردیتے تھے، البتہ بطور قرض رکھنا منظور کرلیتے تھے، اور یہ بات لوگوں کے لئے زیادہ فائدہ مند تھی، کیونکہ قرض کی صورت میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو انہیں وہ رقم ہر حالت میں لوٹانی پڑتی تھی، جبکہ امانت کے طور پر رکھوانے کی صورت میں اگر وہ رقم ناگہانی آفتوں میں تلف ہوجاتی مثلاً چوری، آگ وغیرہ لگنے کی صورت میں، تو وہ اس پیسے کو لوٹانے کے ذمہ دار نہ تھے، جب لوگ ان کو وہ رقم بطور قرض دیتے، وہ اس رقم کو آگے تجارت میں لگادیا کرتے تھے۔ حضرت زبیرؓ کا پیسے رکھنے اور پھر اسے آگے تجارت میں لگانے کا یہ انداز اور طریقہ موجودہ دور کے پرائیویٹ بینکوں کے کافی مشابہ ہے، امام بخاریؒ کی روایت کے مطابق حضرت زبیرؓ کی وفات کے وقت ان کے پاس جمع کردہ رقوم کا جب حساب لگایا گیا تو وہ بائیس لاکھ تھیں، اور وہ تمام کی تمام تجارتی منصوبوں میں لگی ہوئی تھیں۔[1]

(۳) ابنِ سعد کی روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک تجارتی قافلہ شام بھیجنا چاہتے تھے، اور اس مقصد کے تحت انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن

(۱) صحیح البخاری: کتاب الجہاد، کتاب: ۷ باب: ۱۳ حدیث: ۴۱۲۹، فتح الباری ج: ۶ ص: ۲۶۱۔

عوفؓ سے چار ہزار درہم قرض لیا۔[1]

(۴) ابنِ جریر کی روایت کے مطابق ابوسفیانؓ کی بیوی ہندؓ بنت عتبہ نے حضرت عمرؓ سے تجارت کی غرض سے ۴ ہزار روپے قرض لئے، انہوں نے یہ پیسے سامان کی خریداری میں لگائے اور پھر اس سامان کو قبیلۂ کلب کے بازار میں فروخت کیا۔[2]

(۵) بیہقی کی روایت کے مطابق حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ساتھ ہزار درہم بطور قرض لئے، ظاہر ہے کہ کسی غریب شخص کا اتنی بڑی مقدار میں قرض لینا اپنی ذاتی احتیاج کی تکمیل کے لئے نہیں ہوسکتا، جبکہ حضرت مقدادؓ جنہوں نے یہ قرضہ لیا ایسے واحد مال دار صحابی ہیں کہ جن کے پاس غزوۂ بدر میں گھوڑا تھا، اور جن کی زرعی پیداوار حضرت معاویہؓ نے ایک لاکھ درہم میں خریدی تھی۔

(۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب ایک عیسائی نے زخمی کردیا، تو انہوں نے اپنے بیٹے کو بلا کر اسے ہدایت کی کہ وہ ان کے قرض خواہوں کے قرضوں کا حساب کرے۔ ان کے صاجزادے نے جب ان قرضوں کا حساب کیا تو وہ ۸۰ ہزار درہم تھے، بعض حضرات نے حضرت عمرؓ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ یہ رقم بیت المال سے قرض لے کر قرض خواہوں کو ادا کردیں، اور پھر اپنے اثاثے بیچ کر بیت المال کو ادا کردیجئے گا، لیکن حضرت عمرؓ نے یہ تجویز نہ مانی اور اپنے صاجزادے کو ہدایت کی کہ وہ ان کے اثاثے بیچ کر یہ قرضہ ادا کردے، ظاہر ہے کہ ۸۰ ہزار درہم کی رقم ذاتی احتیاج کے لئے قرض نہیں لی جاسکتی۔

(۷) امام مالکؒ نے اپنی کتاب مؤطا میں حضرت عمرؓ کے دو صاجزادوں

(۱) ابنِ سعد: الطبقات الکبریٰ، بیروت ج:۳ ص:۲۷۸۔

(۲) الطبری: تاریخ الامم ج:۳ ص:۲۷۸۔

حضرت عبداللہؓ اور حضرت عبیداللہؓ کا واقعہ ذکر کیا ہے، جو جہاد کے سلسلے میں عراق گئے تھے، سفر سے واپسی کے دوران ان کی ملاقات بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے ہوئی، انہوں نے ان صاحبزادگان کو بتلایا کہ وہ عوامی خزانہ کی کچھ رقم حضرت عمرؓ کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں، انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ یہ رقم امانت کے طور پر ان کو دینے کے بجائے بطور قرض دے دیں، تاکہ وہ رقم حضرت عبداللہؓ اور حضرت عبیداللہؓ کے ضمان میں داخل ہوجائے اور وہ بحفاظت حضرت عمرؓ کے پاس پہنچ جائے، یہ بات حضرت عبداللہؓ اور حضرت عبیداللہؓ کے مفاد میں بھی تھی، کیونکہ وہ رقم بطور قرض لینے کے بعد وہ اس سے عراق سے سامان خرید کر مدینہ لے جاکر فروخت کرسکتے تھے، اور حضرت عمرؓ کو اصل سرمایہ واپس دینے کے بعد انہیں اس سے نفع بھی حاصل ہوجاتا، ان صاحبزادگان نے یہ تجویز قبول کرکے اسی کے مطابق عمل کرلیا۔ جب وہ مدینہ پہنچے اور انہوں نے اصل سرمایہ حضرت عمرؓ کے سپرد کیا تو حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ آیا حضرت ابوموسیٰ نے یہ رقم بطور قرض تمام مجاہدین کو بھی دی تھی؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ حضرت ابوموسیٰ نے تم کو یہ رقم صرف میری رشتے داری کی وجہ سے دی تھی، لہٰذا تم کو نہ صرف وہ رقم بلکہ اس کے اُوپر حاصل ہونے والا نفع بھی دینا چاہئے، حضرت عبیداللہ بن عمرؓ نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ یہ فیصلہ انصاف پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ سرمایہ راستے میں تلف ہوجاتا تو وہ ہر حال میں اس کا نقصان برداشت کرتے، اور اصل سرمایہ بہرصورت واپس کرتے، اس لئے وہ اس پر کمانے والے نفع کے مستحق ہیں، اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے اصرار کیا کہ وہ نفع بھی بیت المال میں جمع کرایا جائے، حاضرینِ مجلس میں سے ایک شخص نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ ان سے سارے نفع کا مطالبہ کرنے کے بجائے ان کے اس معاملے کو مضاربت میں تبدیل کردیں اور ان سے آدھا نفع لے لیا جائے اور بقیہ آدھا دونوں بھائیوں میں تقسیم کردیا جائے، حضرت عمرؓ نے اس تجویز کو تسلیم کرلیا اور اسی کے

مطابق عمل کرلیا۔[۱] ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہؓ اور حضرت عبیداللہؓ کو دیا جانے والا قرضہ تجارتی قرضہ تھا، جس کی ابتداء ہی سے نیت تجارت میں لگانے کی تھی۔

۸۹:- مذکورہ بالا تفاصیل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تجارتی قرضوں کا تصور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کے لئے ربا کی حرمت کے وقت اجنبی نہ تھا، اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ربا کی حرمت صرف صَرفی سود تک محدود تھی اور وہ تجارتی سود کو شامل نہیں تھی۔

اضافی شرحِ سود (Excessive Rates of Interest)

۹۰:- بعض اپیل کنندگان کی طرف سے پیش کی جانے والی ایک دلیل یہ تھی کہ ربا کی حرمت صرف ان معاملات سے متعلق ہے جن میں سود کی شرح بہت زیادہ یا مرکب ہو، ان کی دلیل کی بنیاد سورۂ آل عمران کی درج ذیل آیت ہے:-

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعٰفًا مُّضٰعَفَةً.

(۱۳۰:۳)

ترجمہ:- اے ایمان والو! تم سود نہ کھاؤ دُگنا چوگنا کر کے۔

۹۱:- دلیل یہ پیش کی گئی کہ یہ ربا کو واضح طریقے سے حرام کرنے والی پہلی آیتِ قرآنی ہے، لیکن اس میں ربا کی حرمت کو "اَضْعٰفًا مُّضٰعَفَةً" (دُگنا چوگنا کر کے) کے ساتھ مقید کردیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف وہ ربا حرام قرار دیا گیا ہے جس کی شرح اتنی زیادہ ہو کہ وہ اصل سرمایہ سے دُگنی ہوجائے، جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر سود کی شرح اتنی زیادہ نہ ہو تو وہ حرام نہیں ہے، اور چونکہ بینکوں کے سود کی شرح اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ وہ اصل سرمایہ کے مقابلہ میں دُگنی ہوجائے، لہٰذا وہ سود کی حرمت کے زُمرہ میں نہیں آئے گا۔

---

(۱) امام مالک: مؤطا، باب القرض۔

۹۲:- لیکن یہ دلیل اس حقیقت کو نظرانداز کر رہی ہے کہ ایک ہی موضوع سے متعلق متعدد قرآنی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہئے، قرآنِ کریم کی کسی آیت کی تشریح اسے قرآن ہی میں پائے جانے والے دوسرے مواد سے الگ کرکے نہیں کی جاسکتی، جیسا کہ ابتداء میں ذکر کیا گیا ہے، قرآنِ کریم نے رِبا کے موضوع کو چار مختلف ابواب میں ذکر کیا ہے، ظاہر ہے کہ کوئی بھی آیت اسی موضوع کی دوسری آیت سے کبھی متضاد نہیں ہوسکتی، رِبا کے بارے میں سب سے تفصیلی بیان سورۂ بقرہ میں موجود ہے، جس کا تفصیلی تذکرہ اس فیصلے کے پیراگراف نمبر ۱۵ میں ہوچکا ہے، یہ آیات درج ذیل حکم پر بھی مشتمل ہیں:-

يٰٓـاَيُّهَـا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (البقرہ:۲۷۸)

ترجمہ:- اے مؤمنو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم مؤمن ہو۔

۹۳:- اس آیت میں ''جو کچھ سود رہ گیا ہے'' کا جملہ یہ بتارہا ہے کہ اصل سرمایہ کے اُوپر ہر مقدار چھوڑ دینی چاہئے، اس نکتے کو درج ذیل جملے میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:-

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوٰلِكُمْ.

ترجمہ:- اور اگر تم (عملِ رِبا) سے توبہ کرلو تو پھر تم صرف اصل سرمایہ کے مستحق ہوگے۔

۹۴:- یہ الفاظ اس حقیقت کو پوری طرح واضح کردیتے ہیں کہ عملِ رِبا سے توبہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اصل سرمایہ کے اُوپر ہر قسم کی رقم چھوڑی نہ جائے، اور قرض دینے والا صرف اور صرف اصل سرمایہ کا مستحق ہو۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران کی آیات کے مشترکہ مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سورۂ آلِ عمران

میں موجود یہ الفاظ "اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً" (دُگنا چوگنا کرکے) قیدِ احترازی نہیں ہیں، اور "دُگنا چوگنا" ہونا حرمتِ رِبا کی لازمی شرط نہیں ہے، بلکہ "اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً" کے الفاظ درحقیقت رِبا کی اس بدترین صورت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لائے گئے ہیں جو اس وقت رائج تھی۔

۹۵:- اس نکتے کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہمیں قرآنِ پاک کی تفسیر کا ایک اہم اور بنیادی اُصول سمجھنا ضروری ہوگا، اور وہ یہ ہے کہ قرآنِ پاک دراصل ایسی آئینی یا قانونی کتاب نہیں ہے جسے ایک قانونی متن کے طور پر استعمال کرنا مقصود ہو، بلکہ درحقیقت یہ ایک ایسی راہ نما کتاب ہے جو بہت سارے قوانین و اَحکامات کے ساتھ ایسی باتیں بیان کرتی ہے جو ترغیبی انداز رکھتی ہیں، قانون کی کتابوں کے برخلاف قرآنِ کریم کچھ ایسے الفاظ یا جملے استعمال کرتا ہے جن کا مقصد مزید تاکید یا کسی فعل کی مزید شناعت بیان کرنا ہوتا ہے، ان کا مقصد کسی اَمر یا نہی کے لئے قید لگانا نہیں ہوتا، قرآنِ پاک کے اس انداز کے ثبوت کے لئے خود اس آیت کا مطالعہ کافی ہے:-

لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا۔ (البقرہ:۴۱)

ترجمہ:- میری آیات کو کم قیمت پر مت بیچو۔

۹۶:- اس آیت کا کوئی شخص بھی یہ مطلب نہیں سمجھ سکتا کہ قرآنی آیات کو فروخت کرنے کی حرمت کی وجہ اس کی قیمت کم ہونا ہے، اور اگر اس کو مہنگے داموں فروخت کیا جائے تو جائز ہوگا۔ ذرا سی عقل رکھنے والا شخص بھی اس آیت میں "کم قیمت پر" کی قید کو قیدِ احترازی نہیں سمجھے گا، بلکہ اس کا مطلب کچھ لوگوں کے عملِ بد کو واضح کرنا مقصود ہے کہ وہ اس قدر عظیم گناہ ذرا سی مالی منفعت کے عوض کر بیٹھتے ہیں، یہاں ان پر ملامت کی وجہ سستے داموں بیچنا نہیں، بلکہ خود بیچنے پر ملامت مقصود ہے۔

۹۷:- اسی طرح دُوسری جگہ قرآنِ کریم ارشاد فرماتا ہے:-

وَلَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا.

(النور:۳۳)

ترجمہ:- اور اپنی لڑکیوں کو طوائف بننے پر مجبور نہ کرو، اگر وہ پاک دامنی چاہتی ہوں۔

۹۸:- ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ اگر کوئی لڑکی پاک دامنی نہ چاہتی ہو تو اس کو کوئی شخص طوائف بننے پر مجبور کرسکتا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ عصمت فروشی اَزخود ایک بڑا گناہ ہے، مگر اس کی بُرائی اس وقت اور زیادہ شدید ہوجاتی ہے جب کوئی لڑکی پاک دامنی چاہے اور کوئی شخص اسے عصمت فروشی پر مجبور کرے، اس آیت میں شرط کا اضافہ صرف اس فعلِ بد کی شناعت میں اضافے کے لئے کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح سورۂ آل عمران کی آیتِ رِبا میں ''اضعافًا مضاعفۃ'' (دُگنا چوگنا کرکے) کی قید صرف عملِ رِبا کی مزید خرابی کو بیان کرنے کے لئے لائی گئی ہے، اس میں صرف یہ بتلایا گیا ہے کہ رِبا کا گناہ اس وقت اور زیادہ سخت ہوجاتا ہے جب اس کی شرح سود اتنی زیادہ یا دُگنی ہوجائے، اس آیت کا یہ مقصد اس وقت مزید واضح ہوجاتا ہے جب اس آیت (آل عمران) کو سورۂ بقرہ کی آیات کی روشنی میں پڑھا جائے۔

۹۹:- دُوسرے یہ کہ قرآنِ پاک کی تفسیر ہمیشہ اس تشریح پر مبنی ہونی چاہئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور ان کے صحابہ کرامؓ کے آثار میں مذکور یا ان سے ماخوذ ہو، کیونکہ وہی دراصل قرآنی آیات کے بلاواسطہ مخاطب اور وصول کنندہ تھے، اور وہی قرآنی آیات کے سیاق و سباق اور اس پسِ منظر کو سمجھتے تھے جس کے تحت وہ آیات نازل ہوئی تھیں۔ اس پہلو سے بھی اگر غور کیا جائے تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ رِبا کی حرمت صرف مخصوص شرحِ سود تک محدود نہ تھی، بلکہ حرمتِ سود اصل سرمایہ سے زائد ہر رقم پر محیط تھی، خواہ وہ تھوڑی ہو یا زائد۔

درج ذیل احادیث اس نکتے کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔

(۱) ہم نے پیچھے یہ ذکر کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ربا کی حرمت کا اعلانِ عام اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں فرمایا، ابنِ ابی حاتم کی روایت کے مطابق اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو الفاظ استعمال فرمائے، وہ درج ذیل ہیں:-

اَلا! ان کل رِبا کان فی الجاهلیة موضوع عنکم کله، لکم رءوس أموالکم لا تظلمون ولا تظلمون، واوّل رِبا موضوع رِبا العباس بن عبدالمطلب، موضوع کله. (۱)

ترجمہ:- سنو! تمام سود کی رقوم جو دورِ جاہلیت میں واجب الادا تھیں، وہ سب پوری کی پوری ختم کردی گئیں، تم صرف اپنے اصل سرمایہ کے حق دار رہو گے کہ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تمہارے ساتھ ظلم کیا جائے، اور سب سے پہلا سود جس کے فسخ کا اعلان کیا جاتا ہے وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے، جو کہ مکمل طور پر ختم کردیا گیا ہے۔

یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل سرمایہ سے زائد ہر قسم کی رقم کو مکمل طور سے ختم فرمادیا، اور اس بات کی صراحت کرکے کسی قسم کا شبہ یا ابہام باقی نہ رہنے دیا کہ قرض دینے والے صرف اپنے رأس المال کے حق دار ہوں گے، اس کے علاوہ وہ ایک سکے کے بھی حق دار نہ ہوں گے۔

(۲) حماد بن ابی سلمہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

اذا ارتهن شاة شرب المرتهن من لبنها بقدر علفها فان استفضل من اللبن بعد ثمن العلف فهو ربا. (۲)

(۱) تفسیر ابن ابی حاتم ج:۲ ص:۵۵۱، حدیث:۲۹۲۵۔ تفسیر ابنِ کثیر ج:۱ ص:۳۳۱۔

(۲) الشوکانی: نیل الاوطار ج:۵ ص:۱۹۸۔

ترجمہ:- اگر قرض دینے والا اپنے مقروض سے رہن (گروی) کے طور پر کوئی بکری وصول کرے، تو قرض دینے والا اس کا صرف اتنا دُودھ پی سکتا ہے جتنا اس نے اس کے چارے کھلانے پر صرف کیا، تاہم اگر دُودھ اس کے چارہ سے زیادہ مہنگا ہے تو یہ اضافہ بھی ربا ہے۔

(۳) امام مالکؒ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا درج ذیل فتویٰ ذکر فرماتے ہیں:-

من أسلف سلفًا فلا يشترط الا قضاءه. (۱)

ترجمہ:- جو شخص کسی کو کوئی قرضہ دے تو وہ اس کے ساتھ سوائے اس کی واپسی کی شرط کے دُوسری کوئی شرط نہیں لگا سکتا۔

(۴) امام مالکؒ نے اسی باب میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:-

من أسلف سلفًا فلا يشترط أفضل منه وان كان قبضة من علف فهو ربا. (۲)

ترجمہ:- جو شخص کسی کو کوئی قرضہ دے، وہ اس سے بہتر واپس دینے کی شرط نہیں لگا سکتا، یہاں تک کہ اگر ایک مٹھی بھر چارہ زائد لے لے تو وہ بھی ربا ہے۔

(۵) امام بیہقیؒ سے منقول ہے کہ ایک شخص نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے ایک شخص سے ۵۰۰ اس شرط پر قرض لئے کہ میں اسے اپنا گھوڑا سواری کے لئے عاریۃً (مفت) دوں گا۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا:-

---

(۱) امام مالکؒ: مؤطا ص: ۶۱۳، نور محمد کراچی۔ (۲) ایضاً۔

تمہارا قرض خواہ جو بھی نفع اس گھوڑے سے حاصل کرے گا، وہ ربا ہے۔[1]

(۲) یہی مصنف حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو کسی کو کوئی قرضہ دے اور پھر مقروض شخص اسے کوئی تحفہ دے، تو کیا اس کے لئے یہ تحفہ قبول کرنا جائز ہوگا؟ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:-

اذا أقرض أحدکم قرضًا فأھدیٰ الیه طبقًا فلا یقبله، أو حمله علی دابة فلا یرکبھا، الا أن یکون بینه وبینه قبل ذٰلک.[2]

ترجمہ:- اگر تم میں سے کسی شخص نے کسی کو کوئی قرضہ دیا اور مقروض قرض خواہ کو ایک کھانے کا طبق پیش کردے، تو اسے قبول نہیں کرنا چاہئے، یا مقروض قرض خواہ کو اپنے جانور کی سواری کرائے تو اسے اس کی سواری نہیں کرنی چاہئے، مگر صرف اس صورت میں جب اس قسم کے تحفوں کے تبادلے کا ان دونوں کے درمیان قرضے کے معاملے سے پہلے معمول رہا ہو۔

اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مقروض اور قرض خواہ دونوں کے آپس میں قریبی تعلقات ہوں، اور ان کی عادت یہ رہی ہو کہ ان میں سے ایک دوسرے کو تحفہ دیتا ہو تو اس قسم کا تحفہ قابلِ قبول ہوگا، خواہ ان دونوں کے درمیان قرض کا معاملہ ہو، لیکن اگر ان دونوں کے درمیان اس قسم کے تعلقات نہ ہوں، تو پھر مقروض کو اس سے کوئی تحفہ قبول نہیں کرنا چاہئے، ورنہ اس میں ربا کا شائبہ یا ربا کی بو آجائے گی۔

---

(۱) البیہقی: السنن الکبریٰ ج:۵ ص:۳۵۰۔ (۲) ایضاً۔

(۷) یہی مصنف امام بیہقی، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان سے کسی نے ایک شخص کے بارے میں دریافت کیا کہ اس نے بیس درہم کسی سے قرض لئے، اور اپنے قرض خواہ کو تحفے دینا شروع کیے، جب بھی قرض خواہ اس سے کوئی تحفہ وصول کرتا اسے لے جاکر بازار میں فروخت کردیتا، یہاں تک کہ اس سے وصول ہونے والے تحفوں میں تقریباً ۱۳ درہم اسے وصول ہوگئے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اسے کہا کہ: تمہیں اب ۷ درہم سے زائد نہیں لینا چاہئے۔

(۸) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

کل قرض جر منفعۃً فھو ربوا۔

ترجمہ:- ہر ایسا قرضہ جو نفع کھینچے وہ رِبا ہے۔

یہ حدیث حارث بن ابی اسامہ سے ان کی مسند میں مذکور ہے۔[1]

۱۰۰:- وفاقِ پاکستان کے وکیل محترم ریاض الحسن گیلانی نے اس حدیث کے قابلِ اعتماد ہونے پر اعتراض کرتے ہوئے یہ کہا کہ اس کو بہت سے محدثین نے حدیثِ ضعیف قرار دیا ہے، انہوں نے علامہ مناویؒ کا حوالہ دیا، جنہوں نے اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔

۱۰۱:- یہ بات صحیح ہے کہ متعدد ناقدینِ حدیث نے اس حدیث کو معتمد اور صحیح قرار نہیں دیا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ایک راوی سوار بن مصعب بھی ہیں جنہیں غیر قابلِ اعتماد قرار دیا گیا ہے، لیکن دوسری طرف ایسے بہت سے محدثین بھی ہیں جنہوں نے اس حدیث کو معتمد قرار دیا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ سوار بن مصعب ضعیف راوی ہیں، تاہم یہ حدیث اور بھی ذرائع سے منقول ہے، یہ رائے علامہ

(۱) السیوطی: الجامع الصغیر ج:۲ ص:۹۴۔

عزیزی، امام غزالی اور امام الحرمین (رحمہم اللہ) کی بھی ہے، تاہم یہ یاد رہے کہ یہ سارا اختلاف اس روایت کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں ہے، البتہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ روایت صحابہ کرامؓ کے آثار اور اقوال کے طور پر سب کے نزدیک قابلِ اعتماد ہے، اور بہت سارے صحابہ کرامؓ سے منقول ہے، مثلاً حضرت فضالہ بن عبید کا اثر جو سننِ بیہقی میں مذکور ہے درج ذیل ہے:-

كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا.

ترجمہ:- ہر ایسا قرضہ جو کسی قسم کا نفع کھینچے وہ رِبا کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔

۱۰۲:- امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ بالکل یہی اُصول حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت اُبیّ بن کعب، حضرت عبداللہ بن سلام اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔

۱۰۳:- کسی نے ان روایات کے قابلِ اعتماد ہونے کے بارے میں کلام نہیں کیا ہے، اگر یہ بات بالفرض تسلیم بھی کرلی جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب روایت ضعیف ہے، تب بھی یہ اُصول بہت سارے صحابہ کرامؓ سے مروی ہونے کی وجہ سے ثابت ہوجاتا ہے، چونکہ عموماً صحابہ کرامؓ شریعت کے اُصول بیان کرنے میں بہت محتاط تھے، اور وہ عموماً کوئی ایسا اُصول اپنی رائے سے بیان نہیں فرماتے تھے، لہٰذا بظاہر ایسا لگتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کی طرف سے متفقہ بیان کردہ یہ اُصول درحقیقت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر ہی مبنی تھا، یہاں تک کہ اگر اس مفروضے کو مسترد بھی کردیا جائے تو یہ روایات کم از کم اتنی بات ثابت کردیتی ہیں کہ صحابہ کرامؓ کی رائے کے مطابق رِبا کا تصور ہر اس رقم کو شامل تھا جو اصل سرمایہ سے زائد ہو، خواہ وہ رقم تھوڑی ہو یا زیادہ۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ قرآنِ کریم کے اوّلین بلاواسطہ مخاطب تھے، اور وہی قرآنِ پاک کی آیات کے پسِ منظر اور

سیاق وسباق کو صحیح طور پر سمجھنے والے تھے، اور اسی لئے قرآنِ پاک کی اصطلاحات مثلاً رِبا کے بارے میں ان کا فہم، تشریح کے لئے سب سے مضبوط بنیاد ہے۔

۱۰۴:- وفاقِ پاکستان کے محترم وکیل ریاض الحسن گیلانی نے مندرجہ بالا روایت کے قابلِ اعتماد ہونے کے بارے میں ایک دُوسرے انداز سے اعتراض کیا، اور وہ یہ کہ اس روایت میں جو بات بیان کی گئی ہے وہ ذاتی طور پر بھی کمزور ہے، کیونکہ اگر مقروض ادائیگی کے وقت رضا کارانہ طور پر قرض دینے والے کے مطالبے کے بغیر اَزخود اصل سرمایہ سے زائد ادا کرے تو اسے کبھی بھی رِبا قرار نہیں دیا جاتا، حالانکہ اس روایت میں ذکر کردہ الفاظ اس قسم کی زیادتی اور اضافے کو بھی شامل ہیں، کیونکہ اس صورت میں بھی قرض دینے والے نے اپنے قرض سے نفع اُٹھایا ہے، اگرچہ یہ نفع اس کو مطالبے کے بغیر ملا ہے، لہٰذا اس اُصول کو رِبا کی جامع مانع تعریف قرار نہیں دیا جاسکتا، اور اس قسم کے ڈھیلے اور ہلکے اقوال کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا ان کے صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔

۱۰۵:- محترم وکیل صاحب کا یہ اندازِ فکر درحقیقت قدیم اہلِ عرب کے روزمرّہ اندازِ بیان کو مدِنظر نہ رکھنے پر مبنی ہے، وہ پیچیدہ قانونی زبان استعمال کرنے کے بجائے اپنا مفہوم سادہ انداز میں بیان کرنے کے عادی تھے، وہ اکثر اوقات ایک طویل مفہوم انتہائی مختصر الفاظ میں بیان کرتے تھے، مندرجہ بالا روایت میں لفظِ "قــــرض" کے ساتھ "جَــــرَّ" کا لفظ مذکور ہے، جس کے لغوی معنی کھینچنے کے آتے ہیں، لہٰذا اگر پورے جملے کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ "ہر ایسا قرض جو اپنے ساتھ نفع کھینچ کر لائے وہ رِبا ہے" اس عبارت کے الفاظ یہ واضح کرتے ہیں کہ رِبا سے مراد صرف وہ معاملہ ہے جہاں پر قرضہ اپنے ساتھ اس طرح نفع کھینچ کر لائے کہ گویا کہ عقدِ قرض نفع کے ساتھ مشروط ہو، لہٰذا اس سے مقروض کی جانب سے اَزخود رضا کارانہ طور پر دیا جانے والا نفع رِبا کی تعریف سے خارج ہوجاتا ہے۔

۱۰۶:- مذکورہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس بات میں کوئی وزن نہیں ہے کہ حرمتِ رِبا صرف حد سے زائد ریٹ آف انٹرسٹ تک محدود تھی، قرآن و حدیث کی تعلیمات اس سلسلے میں بالکل واضح ہیں کہ راَس المال پر وصول کی جانے والی کوئی بھی اضافی رقم خواہ کم ہو یا زیادہ اگر عقدِ قرض میں مشروط ہوگی تو وہ ''رِبا'' کہلائے گی، لہٰذا وہ حرام ہوگی۔

رِبا الفضل اور بینکاری قرضے

۱۰۷:- مزید آگے بڑھنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وفاقِ پاکستان کے محترم وکیل کی ایک اور دلیل پر نظر ڈالتے چلیں کہ انہوں نے فرمایا کہ واپسی کے وقت اضافے کی شرط اگر ابتدائے عقد میں لگائی جائے تو وہ رِبا القرآن کے زُمرے میں نہیں آتی، البتہ وہ رِبا الفضل کے زُمرے میں آتی ہے، تاہم اگر ابتدائے عقد میں اضافہ مشروط نہ ہو تو اسے مہلت دیتے ہوئے رقم میں اضافہ کرنا یہ رِبا القرآن ہے۔ محترم وکیل کی رائے کے مطابق چونکہ بینکاری قرضوں میں اضافہ ابتدائے عقد ہی میں طے کرلیا جاتا ہے لہٰذا یہ اضافہ رِبا القرآن نہیں بلکہ رِبا الفضل ہے، پھر محترم وکیل صاحب نے مزید دلائل دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ رِبا الفضل کی حرمت کی تنفیذ دراصل ریاست کا کام نہیں ہے، اس کا نفاذ دراصل مسلمان کی انفرادی ذمہ داری ہے۔ اور مسلمانوں کی تاریخ میں اسے خلفائے راشدینؓ یا مسلمان حکمرانوں میں سے کسی نے بھی اپنے کسی حکم، فرمان یا قانون کے ذریعہ ختم نہیں کیا۔ انہوں نے مزید یہ بھی فرمایا کہ رِبا الفضل کی حرمت مسلمان ریاست میں رہائش پذیر غیر مسلموں پر بھی لاگو نہیں ہوتی، لہٰذا اسے آئینِ پاکستان کے آرٹیکل ۲۰۳ب میں بیان کردہ اصطلاح ''مسلم پرسنل لاء'' کے تحت آنا چاہئے، جو کہ وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کی شریعت اپیلٹ بینچ کے دائرۂ اختیارِ سماعت سے باہر ہے۔

۱۰۸:- محترم وکیل صاحب کی دلیل ایک ایسے نظریے پر قائم ہے جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں، اور وہ یہ کہ کوئی بھی اضافی رقم اگر قرض کی ابتداء میں مشروط کرلی جائے تو وہ ربا القرآن کے بجائے ربا الفضل بن جاتی ہے۔ اس دلیل کا پہلا حصہ یہ بیان کرتا ہے کہ ربا القرآن کی تعریف تو صرف اس صورت تک محدود ہے جہاں پر قرض دہندہ قرضے کی میعاد کے اختتام پر مقروض کو مزید وقت کی مہلت دیتے ہوئے اپنے مطالبے میں اضافہ کردیتا ہے، مگر اس دلیل پر بحث اس فیصلے کے پیراگراف ۴۳ تا ۵۴ میں پیچھے گزر چکی ہے، جس میں ہم نے یہ بیان کیا تھا کہ ربا القرآن صرف اسی صورت تک منحصر نہیں ہے بلکہ یہ رأس المال پر اضافی رقم کے مطالبے کو شامل ہے، خواہ وہ مطالبہ ابتداء میں کیا جائے یا انتہائے میعاد پر۔ آیئے اب ہم اس دلیل کے دُوسرے حصے پر غور کرتے ہیں کہ جس میں ان کے نزدیک اصل قرض پر کوئی اضافی رقم اگر ابتدائے عقدِ قرض میں طے کی جائے تو وہ ربا الفضل کی تعریف میں داخل ہے نہ کہ ربا القرآن کی تعریف میں۔ محترم وکیل صاحب ربا الفضل کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اتنے آگے نکل گئے کہ غیرسودی قرضوں کو بھی انہوں نے ربا الفضل میں داخل کردیا، کیونکہ حدیث کی رُو سے بشمول سونا اور چاندی چھ چیزوں کا باہم تبادلہ کیا جائے تو وہ نقد ہونا چاہئے، اگر سونے کا تبادلہ سونے سے کیا جائے مگر اس میں ایک جانب اُدھار ہو تو وہ ربا الفضل میں داخل ہوگا، اسی لئے محترم وکیل صاحب نے یہ خیال فرمایا کہ اگر سونے چاندی کے ذریعے قرض کا کوئی بھی معاملہ کیا جائے جس میں اس قرضے کی ادائیگی مؤخر ہو تو وہ ربا الفضل میں داخل ہوجائے گا، لہٰذا وہ مکروہ ہوگا، باوجودیکہ وہ بغیر اضافے کے لوٹایا گیا ہو، کیونکہ سونے کا معاملہ سونے کے ذریعے (یا رقم کا تبادلہ رقم کے ذریعے) صرف اس وقت جائز ہوتا ہے جبکہ دو شرطیں پائی جائیں:-

الف:- دونوں طرف سے مقدار برابر ہو۔

ب:- تبادلہ نقد ہو، اُدھار نہ ہو۔

۱۰۹:- غیرسودی قرضے میں دُوسری شرط (ب) مفقود ہے، جبکہ سودی قرضوں میں مذکورہ بالا دونوں شرطیں موجود نہیں ہیں، لہٰذا دونوں قسم کے قرضے ربا الفضل کی تعریف میں داخل ہیں۔

۱۱۰:- محترم وکیل صاحب کا یہ نقطۂ نظر بالکل ناقابلِ تسلیم ہے، کیونکہ یہ عقدِ بیع اور عقدِ قرض کے درمیان شدید خلط ملط پر مبنی ہے، محترم وکیل صاحب نے عقدِ قرض کو عقدِ بیع کی مانند اور مساوی قرار دیا ہے، حالانکہ ربا الفضل کی حدیث خرید و فروخت کے معاملے سے متعلق ہے نہ کہ قرضے کے معاملے کے، حدیث کے حقیقی الفاظ یہ ہیں:-

لا تبیعوا الذهب بالذهب الا مثلا بمثل ..... ولا تبیعوا منها غائبًا بناجز.

ترجمہ:- سونے کو سونے کے ذریعے مت بیچو، مگر برابر سرابر اور اُدھار (سونے یا چاندی کو) نقد (سونے یا چاندی) کے عوض مت فروخت کرو۔

۱۱۱:- یہاں پر ''فروخت نہ کرو'' کے الفاظ یہ بتلانے کے لئے کافی ہیں کہ حدیث کی گفتگو عقدِ بیع کے بارے میں ہے، نہ کہ عقدِ قرض کے بارے میں۔ دراصل دونوں عقدوں کے درمیان بہت سارے فرق ہیں، ایک اہم فرق یہ ہے کہ عقدِ بیع میں اگر قیمت کی ادائیگی متعینہ مدّت تک کے لئے اُدھار ہو تو فروخت کنندہ اس وقت سے قبل کسی بھی قیمت کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں کرسکتا، اس کے برخلاف عموماً غیرسودی قرضوں میں قرض دہندہ مقروض سے کسی بھی وقت اپنے قرضے کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے، یہاں تک کہ اگر ادائیگی کے لئے کوئی وقت بھی متعین کیا گیا ہے تو وہ معینہ وقت صرف اخلاقی اہمیت تو رکھے گا لیکن وہ قانونی طور پر واجب التعمیل نہیں

ہوگا۔[1] یہی وجہ ہے کہ غیر سودی قرضہ تو جائز ہے لیکن سونے کو سونے کے ساتھ اُدھار ادائیگی کی شرط پر بیچنا جائز نہیں ہے۔

محترم وکیل صاحب کا یہ نقطۂ نظر کہ غیر سودی قرضہ بھی رِبا الفضل میں داخل ہے، صرف اس وجہ سے بھی ناقابلِ اعتبار ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف غیر سودی قرضوں کی اجازت دی، بلکہ اس زمانے میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کو سونے کے ذریعے اُدھار بیچنے پر منع فرمایا، خود غیر سودی قرضوں کا معاملہ فرمایا۔ محترم وکیل صاحب نے ان احادیث کا حوالہ دیا کہ جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حقیقی ضرورت کے بغیر قرضے لینے کا ناپسند فرمایا ہے اور اس شخص کے جنازے میں شرکت نہیں کی جو مقروض حالت میں مرا ہو۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرضے لینے کو اس وجہ سے ناپسند نہیں فرمایا کہ وہ عقد بذاتِ خود ناجائز تھا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس واضح وجہ سے منع فرمایا کہ یہ کسی بھی شخص کو حقیقی ضرورت کے بغیر اپنے اُوپر قرضے کا بوجھ لینے کا کوئی بھی مشورہ نہیں دے سکتا، اور اگر ممانعت کی اصل وجہ قرضے کا عقد ہوتا تو پھر یہ ممانعت قرض دہندہ اور مقروض دونوں کے لئے ہوتی، جبکہ یہ بات واضح ہے کہ یہ ممانعت قرض دہندہ کے لئے ہرگز نہیں ہے، بلکہ محترم وکیل صاحب نے ابنِ ماجہ کی یہ حدیث اَزخود ذکر فرمائی ہے کہ قرضہ دینا صدقہ سے زیادہ باعثِ فضیلت اور ثواب ہے۔[2] اس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ قرض کا معاملہ بذاتِ خود ناجائز نہیں ہے، تاہم لوگوں کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ بغیر حقیقی وجہ کے اپنے اُوپر قرضے کا بوجھ نہ لیں۔ اس کے برخلاف سونے کی سونے کے ساتھ یا چاندی کی چاندی کے ساتھ اُدھار فروختگی کا معاملہ بذاتِ خود ناجائز معاملہ

---

(۱) الجصاص: أحكام القرآن لاہور ۱۹۸۰ء ص:۴۸۲، ۴۸۳ تفصیل کے لئے۔

(۲) ابنِ ماجہ: السنن ج:۳ ص:۱۵۴ حدیث:۲۴۳۱ بیروت ۱۹۹۶ء، یہ بات یاد رہے کہ اس حدیث کو البوصیری وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔

ہے، اور یہ معاملہ دونوں فریقوں کے لئے ناجائز ہے، اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اس کی اجازت نہیں ہے۔

۱۱۲:- خلاصہ یہ کہ ربا الفضل کی احادیث صرف خرید و فروخت سے متعلق ہیں، قرض کے معاملے سے ان کا بالکل تعلق نہیں ہے، تاہم ربا القرض قرضے کے معاملے سے متعلق ہے، جس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ قرض دہندہ صرف اپنے سرمایہ کا حق دار ہوگا، اس سے زائد رقم کا بالکل حق دار نہ ہوگا، لہٰذا اگر وہ صرف قرضے کا معاملہ کرے اور اپنے سرمایہ پر کسی قسم کے اضافے کا مطالبہ نہ کرے، تو پھر وہ بالکل ممنوع نہیں ہے، اس لئے یہ بات کہنا صحیح نہیں ہے کہ سودی قرضے کا معاملہ جس میں ابتدائے عقد میں اضافی رقم طے کی جائے وہ ربا القرآن کے بجائے ربا الفضل میں داخل ہوگا اور یہ کہ بینکاری معاملات چونکہ ربا الفضل میں داخل ہیں لہٰذا حرام نہیں ہیں۔

سودی قوانین میں اس کورٹ کا دائرہ اختیار

۱۱۳:- یہ بات طے ہوجانے کے بعد کہ بینکاری قرضوں پر وصول کئے جانے والا سود دراصل ربا الفضل کے بجائے ربا القرآن کے زُمرے میں آتا ہے، اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اس سوال پر غور کریں کہ آیا اس کی حرمت غیر مسلموں پر بھی لاگو ہے یا نہیں؟ تاہم یہ بات باور کرانا پسند کریں گے کہ محترم وکیل صاحب نے ایک نقطۂ نظر یہ پیش کیا کہ ربا الفضل کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہونے کی وجہ سے بینکاری سود سے متعلق قوانین مسلم پرسنل لاء کی تعریف میں آتے ہیں، جو دستور پاکستان کے آرٹیکل ۲۰۳ب میں ذکر کی گئی ہے، لہٰذا یہ وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کی شریعت اپیلٹ بینچ کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ اگر ہم بالفرض ان کا یہ نقطۂ نظر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلیں کہ بینک انٹرسٹ ربا الفضل میں شامل ہے اور اس کی حرمت صرف مسلمانوں سے متعلق ہے، تب بھی ان کا یہ موقف کہ زیرِ نظر

قوانین وفاقی شرعی عدالت کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں، دو واضح وجوہات کی وجہ سے قابلِ رَدّ ہے:-

۱۱۴:- پہلا یہ کہ موجودہ مقدمے میں غور طلب قوانین وہ قوانین ہیں جو موجودہ شکل میں موجود ہیں، نہ کہ اس شکل میں جس میں وہ فاضل وکیل صاحب کے خیال کے مطابق ہونے چاہئیں، یہ موجودہ قوانین اپنے اطلاق کے لحاظ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ذرا بھی تفریق نہیں کرتے، وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں پر یکساں لاگو کئے جاتے ہیں۔

۱۱۵:- دُوسرے یہ کہ یہ خیال کہ یہ قوانین مسلم پرسنل لاء کی تعریف کے تحت جو کہ دستورِ پاکستان کے آرٹیکل ۲۰۳ب میں مذکور ہے، صرف مسلمانوں پر قابلِ اطلاق ہوں گے، اس کی بنیاد بظاہر اس عدالت کا وہ فیصلہ ہے جو مسماۃ فرشتہ کے مقدمے (پی ایل ڈی - ۱۹۸۱، سپریم کورٹ ۱۲۰) میں دیا گیا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محترم وکیل صاحب شاید اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں کہ اس عدالت نے اپنے موقف کا بعد میں ایک دُوسرے مقدمے ڈاکٹر محمود الرحمٰن بنام حکومتِ پاکستان (پی ایل ڈی ۱۹۹۴ ایس سی ۶۰۷) کے فیصلے میں دوبارہ جائزہ لیا ہے، جس میں یہ قرار دیا گیا کہ مدوّن قوانین (Statute Laws) اگرچہ صرف مسلمانوں پر لاگو ہوتے ہیں، پھر بھی دستورِ پاکستان کی دفعہ ۲۰۳ب میں مذکور مسلم پرسنل لاء کے تحت داخل نہیں ہوتے، لہٰذا وکیل صاحب کا یہ خیال غلط ہے کہ بینکاری سود سے متعلقہ قوانین اس عدالت کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں۔

حرمت کی بنیادی وجہ

۱۱۶:- بعض اپیل کنندگان کی طرف سے دُوسری دلیل یہ پیش کی گئی کہ حرمتِ رِبا کی بنیادی علت ظلم ہے، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:-

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوٰلِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ.

(۲۷۹:۲)

ترجمہ:- اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے واسطے تمہارا اصل سرمایہ ہے کہ نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

۱۱۷:- یہاں ''نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے'' کے الفاظ کی حرمت کی بنیادی علت ظلم ہے۔ بعض اپیل کنندگان کی طرف سے یہ دلیل دی گئی کہ ان مال دار لوگوں سے سود وصول کرنے میں قطعاً کوئی ظلم نہیں جنہوں نے خطیر نفع کمانے کے لئے بھاری بھاری رقمیں قرضے پر حاصل کیں، بینکوں اور مالیاتی اداروں کے تجارتی سود میں چونکہ حرمت کی بنیادی علت موجود نہیں ہے، لہٰذا اسے ممنوع قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بالکل یہی دلیل جناب خالد ایم اسحاق صاحب ایڈووکیٹ نے بھی دی جو باوجود اپنی علالتِ طبع کے ازراہِ عنایت اس مقدمے میں عدالتی مشیر کی حیثیت سے تشریف لائے، تاہم انہوں نے بینکاری کی تمام صورتوں کو جائز قرار دینے کے بجائے یہ رائے دی کہ تمام بینکاری کے معاملات اور معاہدات کا انفرادی حالات اور واقعات کے تناظر میں جائزہ لینا چاہئے، اور اس تجزیے کا معیار اور محور یہ سوال ہونا چاہئے کہ آیا اس مخصوص عقد میں ظلم کا عنصر پایا جارہا ہے یا نہیں؟ اگر ظلم موجود ہو تو پھر اس عقد کو رِبا سمجھ کر ناجائز قرار دینا چاہئے، لیکن اگر اس میں ظلم نہ ہو تو پھر اسے حرام نہیں سمجھنا چاہئے۔

۱۱۸:- ہم نے دلائل کے ان خطوط پر بھی غور کیا، لیکن اسے تسلیم کرنے سے قاصر رہے، درحقیقت ان کی دلیل دو تصوّرات پر مبنی ہے، ایک یہ کہ حرمت کی بنیادی علت ظلم ہے، اور دُوسرے یہ کہ موجودہ سودی نظام بینکاری میں یا تو کوئی ظلم نہیں ہے یا کم از کم بعض سودی معاملات میں ظلم نہیں ہے۔

اس دلیل کے دونوں حصے، گہرے مطالعے کے بعد بھی قابلِ تسلیم نظر نہیں آتے، آیئے اب دونوں تصوّرات کا علیحدہ علیحدہ تجزیہ کریں۔

علت اور حکمت کے درمیان فرق

۱۱۹:- پہلا تصور جو کہ ظلم کو حرمتِ ربا کی بنیادی علت قرار دیتا ہے، درحقیقت حرمت کی علت کو اس کی حکمت سے خلط ملط کرنے کا نتیجہ ہے۔ یہ اسلامی فقہ کا ایک طے شدہ اُصول ہے کہ علت اور حکمت کے درمیان بہت فرق ہے، علت کسی معاملے کا ایسا وصف ہوتا ہے کہ جس کے بغیر متعلقہ قانون اس پر لاگو نہیں ہوتا، جبکہ حکمت اس مصلحت یا فلسفے کا نام ہے جو کوئی قانون ساز قانون بناتے وقت مدِنظر رکھتا ہے یا بالفاظِ دیگر اس فائدے کا نام ہے جو قانون کی تنفیذ کے ذریعے حاصل کرنا مقصود ہو، اب قاعدہ یہ ہے کہ کسی قانون کا اطلاق علت پر مبنی ہوتا ہے نہ کہ حکمت پر، بالفاظِ دیگر اگر کبھی علت (کسی معاملے کا بنیادی وصف) پائی جائے جبکہ اس کی حکمت اس میں نظر نہ آرہی ہو تو قانون پھر بھی اطلاق پذیر ہوگا۔ یہ اُصول غیر اسلامی قوانین میں بھی مُسلَّم ہے، اس کی آسان مثال لے لیں کہ قانون نے تمام شہریوں پر لازم کیا ہے کہ جب وہ سڑک پر جارہے ہوں اور سرخ بتی جل رہی ہو تو وہ رُک جائیں، اس قانون میں علت سرخ بتی کا جلنا ہے، جبکہ حکمت حادثات سے بچاؤ ہے۔ اب قانون ہر اس وقت لاگو ہوگا جب بھی سرخ بتی جلے گی، اس کا اطلاق حادثے کے خوف ہونے یا نہ ہونے پر مبنی نہ ہوگا، چنانچہ اگر سرخ بتی کھلی ہو تو ہر گاڑی رُکنے پر مجبور ہوگی خواہ اس کے سامنے دونوں طرف کی سڑکوں سے کوئی ٹریفک نہ آرہی ہو، اس متعین صورت میں قانون کی بنیادی حکمت نظر نہیں آرہی ہے، کیونکہ کسی قسم کے حادثے کا کوئی خطرہ نہیں ہے، پھر بھی قانون اپنی پوری قوت کے ساتھ اطلاق پذیر ہے، کیونکہ سرخ بتی جو کہ اس قانون کی بنیادی علت ہے، وہ موجود ہے۔ ایک دُوسری مثال لے لیجئے، قرآنِ پاک نے شراب حرام قرار دی ہے، اس کی حرمت کی علت نشہ ہے، جبکہ اس کی حکمت جو قرآن میں مذکور ہے، وہ یہ ہے کہ:-

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ، فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ.

ترجمہ:- شراب اور جوئے کے ذریعے شیطان تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈالنا چاہتا ہے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے روکنا چاہتا ہے، تو پھر کیا تم باز آؤ گے؟

۱۲۰:- شراب اور قمار کی حرمت کا بنیادی فلسفہ جو قرآن کی اس آیت میں مذکور ہے، وہ یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں لوگوں کے درمیان عداوت اور بغض پیدا کرتی ہیں، اور یہ انہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روکتی ہیں، کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں کافی عرصے سے شراب پی رہا ہوں، لیکن میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے، لہٰذا شراب کی حرمت کی علت نہیں پائی جارہی ہے اور وہ مجھ پر حلال ہونی چاہئے؟ یا کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ شراب پینے کی وجہ سے میری کوئی نماز ترک نہیں ہوئی اور میں نماز پابندی سے اوقات کے مطابق پڑھتا ہوں، لہٰذا حرمتِ شراب کی بنیادی وجہ نہ پائے جانے کی وجہ سے شراب میرے لئے حلال ہونی چاہئے؟ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان دلائل کو قبول نہیں کرسکتا، کیونکہ عداوت اور بغض کے قرآنِ پاک کی اس آیت میں تذکرے کا مقصد اس کی حرمت کی علت بیان کرنا نہیں تھا، بلکہ اس میں تو صرف شراب اور قمار سے پیدا ہونے والے ان بُرے نتائج کا ذکر ہے جو اکثر ان سے پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا انہیں حرمت کی حکمت یا فلسفہ تو کہا جاسکتا ہے، علت نہیں کہا جائے گا، لہٰذا ان کی حرمت ان بُرے نتائج کے پائے جانے یا نہ پائے جانے پر منحصر نہیں ہوگی۔ بالکل یہی صورتِ حال ربا والی قرآنی آیت کے اندر بھی ہے کہ اس میں ظلم کا تذکرہ حرمت کی حکمت اور فلسفے کے طور پر کیا گیا ہے، لہٰذا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جہاں پر بظاہر ظلم نظر نہ آرہا ہو وہاں پر حرمت نہیں آئے گی، ربا کی بنیادی علت قرض کے

معاملے میں وہ زیادتی ہے جو اصل سرمایہ کے اُوپر طلب کی جائے، اور جیسے ہی یہ علت پائی جائے گی حرمت آجائے گی، خواہ اس صورت میں قانون کا فلسفہ اور حکمت نظر آئے یا نہ آئے۔

۱۲۱:- یہاں ایک اور نکتہ قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ کسی قانون کی علت ہمیشہ ایسی چیز ہوتی ہے جس کی شناخت جامع و مانع تعریف کے ذریعے ہو سکے اور جس میں اس اختلاف اور نزاع کی گنجائش نہ ہو کہ آیا اس صورت میں علت پائی جارہی ہے یا نہیں؟ کوئی بھی اضافی اصطلاح جو اپنی فطرت کے لحاظ سے مبہم ہو وہ کسی قانون کی علت قرار نہیں دی جاسکتی؛ کیونکہ اس کا وجود مشکوک اور مبہم ہونے کی وجہ سے قانون کے حقیقی مقصود کو فوت کردے گا۔ ظلم بھی اسی طرح ایک ایسی اضافی اور مبہم اصطلاح ہے کہ اس کی حقیقی ماہیت اور تعریف متعین کرنا انتہائی مشکل کام ہے، باہم اختلاف رکھنے والے تمام سیاسی و معاشی نظام ظلم ختم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، تاہم ایک چیز جسے ایک نظام ظلم قرار دیتا ہے، تو اسے دُوسرا نظام جائز اور صحیح قرار دیتا ہے، اشتراکی نظریۂ معیشت ذاتی ملکیت کو بذاتِ خود ظلم قرار دیتا ہے، جبکہ سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ ذاتی ملکیت ختم کرنے کو ظلم قرار دیتا ہے، اس قسم کی مبہم اصطلاح کو کسی قانون کی علت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۱۲۲:- مسٹر خالد ایم اسحاق ایڈووکیٹ جو اس کورٹ میں قانونی مشیر کے طور پر پیش ہوئے تھے، انہوں نے ایک دُوسرا انداز اختیار فرمایا، ان کے نزدیک ظلم یا رِبا کی جامع مانع تعریف کا موجود نہ ہونا اَزخود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے یہ سہولت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ خود فیصلہ کرلیں کہ ان کے زمانے کے مخصوص حالات میں ظلم کیا ہے؟

اپنے تحریری بیان میں محترم قانونی مشیر نے مذکورہ ذیل الفاظ میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے:-

(الف) (ربا کی) تعریفیں گھڑنے کی جو کوششیں غلط سمت میں ہو رہی ہیں، اب وہ ختم ہوجانی چاہئیں۔ قرآن میں ربا کی تعریف مذکور نہ ہونے کو جوں کا توں تسلیم کرلینا چاہئے، بلکہ اسے انسانیت کے لئے ایک رحمت سمجھنا چاہئے، کسی جامد تعریف سے سوچا سمجھا اجتناب مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کرے گا کہ وہ خود اپنی رہنمائی کے لئے آگے آئیں اور ایسے اُصول پروان چڑھائیں جو زمان، مکان کے حالات میں ظلم کی شناخت کرسکیں۔ معاشی حالات جامد نہیں ہوتے، نہ انسانی احوال جامد ہوتے ہیں۔

(ب) ایک صحت مند معاشی پالیسی میں حکومت کے ایسے تمام بامقصد اقدامات شامل ہونے چاہئیں جن کا حقیقی اور برملا بنیادی مطمحِ نظر حکومت کے زیرِ انتظام ساری آبادی کی معاشی فلاح و بہبود ہو نہ کہ اس آبادی کے کسی ایک حصے کی۔ اسلامی تصورِ معیشت اس مقصد کا نہ مخالف ہے، نہ اس سے مختلف، لہٰذا ایک اسلامی طرزِ فکر کو معاشی طرزِ فکر پروگرام سے نہ جدا کیا جانا چاہئے، نہ اس سے الگ تھلگ۔ نہ اسلامی طرزِ فکر کو اس سے لاعلم ہونا چاہئے، کیونکہ یہ دونوں ایک دُوسرے کے حریف نہیں ہیں۔ فقہاء کو اس امکان سے اپنے ذہن کو بند نہ کرلینا چاہئے کہ بہترین اور مفید نتائج حاصل کرنے کے لئے دونوں کو جمع بھی کیا جاسکتا ہے، جب کبھی مسلمان فقہاء نے اپنے آپ کو عصری علوم (اور زیرِ نظر معاملے میں معاشیات) سے پوری طرح باخبر نہیں رکھا، تو ان میں یہ رُجحان پیدا ہوگیا کہ وہ اس کے مخالف

ہو جائیں، اسے شک کی نگاہوں سے دیکھیں، اسے خطرناک سمجھیں اور اس کے مطالعے سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس پر ''غیر اسلامی'' کا لیبل لگا دیں۔

۱۲۳:- ہم نے اس اندازِ فکر پر کما حقہ کافی غور کیا، لیکن فاضل مشیرِ عدالت کے پورے احترام کے باوجود ان کی یہ دلیل چند بنیادی نکات کو نظر انداز کرتی نظر آتی ہے۔

۱۲۴:- پہلی بات یہ ہے کہ محترم مشیرِ عدالت نے قرآنِ پاک میں رِبا کی جامع مانع تعریف مذکور نہ ہونے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت قرار دیا ہے۔ یہ دلیل اس مفروضے پر قائم ہے کہ وہ تمام اُمور جنہیں شریعت نے حرام قرار دیا ہے، ان کی کوئی تعریف قرآن میں موجود ہے، اور صرف رِبا کی صورت میں قرآنِ پاک نے دانستہ اس کی تعریف ذکر نہیں فرمائی۔ اس کے برعکس صورتِ حال یہ ہے کہ قرآن شاید ہی کسی حرام کام کی کوئی تعریف ذکر کرتا ہو، قرآن میں نہ شراب کی تعریف مذکور ہے، نہ زنا کی، نہ چوری کی، نہ ڈاکے کی، یہاں تک کہ کفر کی بھی کوئی تعریف مذکور نہیں، اسی طرح قرآن میں اَوامر مثلاً نماز، روزہ، حج اور جہاد کی تعریف مذکور نہیں ہے، اب کیا ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ ان تصورات میں سے کوئی بھی کوئی مخصوص مطلب نہیں رکھتا، اور اس وجہ سے یہ تمام اَحکامات زمان، مکان کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ قرآنِ کریم نے درحقیقت ان تصورات کی کوئی قانونی تعریف اس لئے نہیں دی کیونکہ ان کے معانی خود اتنے زیادہ واضح تھے کہ وہ محتاجِ وضاحت نہیں تھے، اس بات کا امکان ہے کہ ان تصورات کی کچھ ذیلی تفصیلات بہت زیادہ واضح نہ ہوں اور وہ اختلافِ آراء کا سبب بن رہی ہوں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے بنیادی تصور ہی کو خلا میں تیرتا چھوڑ دیا گیا ہے جن کا کوئی مخصوص مفہوم ہے ہی نہیں۔

۱۲۵:- دُوسرے یہ کہ محترم قانونی مشیرِ عدالت نے مندرجہ بالا اقتباس کے خط کشیدہ جملوں میں صحت مند اقتصادی پالیسی کی بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ وضاحت فرمائی ہے، کوئی بھی شخص اس کی سچائی کا بمشکل ہی انکار کرسکتا ہے، تقریباً تمام معاشی نظام انہی مقاصد کے حصول کی کوششوں کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ انہیں حاصل کیسے کیا جائے؟ اس سوال کے جواب نے ہی مختلف معاشی نظاموں کو ایک دُوسرے کے مدّمقابل لاکھڑا کیا ہے، محترم ایڈووکیٹ نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اسلامی ذہنیت کو معاشی پروگرام سے الگ نہیں کرنا چاہئے، یہ مشورہ کافی معقول معلوم ہوتا ہے۔

لیکن جب یہ مشورہ اس سیاق وسباق میں دیا جارہا ہے کہ ربا کی تعریف کو متعین نہ کیا جائے اور ایسے اُصول پروان چڑھائے جائیں جو زمان، مکان کے حالات میں ظلم کی شناخت کرسکیں تو اس کا کھلا مطلب یہ ہے کہ ظلم کی شناخت اور نتیجتاً حلال وحرام کے فیصلے میں حتمی کردار ''معاشی اندازِ فکر'' ہی ادا کرے گا۔ اگر یہ مفروضہ تسلیم کرلیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سا ''معاشی اندازِ فکر''؟ اس وقت بے شمار معاشی نظریات میدان میں ہیں جو ایک دُوسرے سے برسرِ پیکار ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اس ''صحت مند معاشی پالیسی'' کے لئے دُوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے جو ''ساری آبادی کی معاشی فلاح و بہبود'' کو بہتر بناسکے۔

ایک فلاحی معیشت کے بنیادی مقاصد ہر اس شخص کو تسلیم ہیں جو معاشی موضوعات پر کچھ بھی سوچ بچار کرتا ہو، لیکن ان مقاصد کو حقیقت کا رُوپ دینے کے لئے حکمتِ عملی کیا ہو؟ یہ بات ہے جو بڑے اختلافات پیدا کرتی ہے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اسلام کی حکمتِ عملی اتنی تنگ نہیں ہے کہ وہ انسانیت کی سدا بدلتی ہوئی ضروریات کا خیال نہ رکھ سکے، نہ وہ اتنی متعصب ہے کہ وہ کسی نئی فکر کے

ساتھ چل نہ سکے، لیکن ساتھ ہی وہ جدید نظریات کی اتنی محتاج بھی نہیں ہے کہ مذکورہ مقاصد کے حصول کے لئے اپنا راستہ خود بنانے کے قابل نہ ہو۔ اسلام کے لئے کسی بھی تعمیری تجویز کو خوش آمدید کہنا کوئی مسئلہ نہیں ہے، خواہ وہ تجویز کسی بھی طرف سے آئی ہو، لیکن ساتھ ہی اسلام کے کچھ اپنے اُصول ہیں جن پر کوئی مصالحت نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ خدائی رہنمائی پر مبنی ہیں، اور یہ بات اسلامی معیشت کی ایسی بنیادی خصوصیت ہے جو اسلامی اور لادینی معیشت کے درمیان واضح خطِ امتیاز کھینچتی ہے، ربا کی حرمت انہی بنیادی اُصولوں کا ایک حصہ ہے، لہٰذا اس اُصول کو لادینی معاشی پالیسی کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا، گھوڑے کے آگے چھکڑا جوتنے کے مترادف ہے۔

۱۲۶:- تیسرے یہ کہ ظلم کو ختم کرنا صرف ربا ہی کی حرمت کا سبب اور حکمت نہیں ہے، بلکہ یہی حکمت بیشتر ایسے اسلامی اَحکام کی بھی ہے جو کاروبار اور تجارت سے متعلق ہیں۔ قرآن وحدیث نے ان معاملات میں جب بھی کوئی اَوامر ونواہی عطا فرمائے ہیں تو ان اَحکام کے بارے میں انہوں نے لوگوں کے عقلی تخمینوں پر اعتماد نہیں کیا، اور نہ ہی انہوں نے ان معاملات کو انسانی عقل کے رحم وکرم پر چھوڑا کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ اس میں ظلم ہے یا نہیں؟ اگر قرآنِ پاک اور سنت اس قسم کا فیصلہ انسانی عقل کے سپرد کردیتے تو پھر اَحکامات اور حرمات کی اس قدر طویل فہرست بذریعۂ وحی فراہم نہ کی جاتی، بلکہ صرف اتنا حکم دے دیا جاتا کہ تم لوگ اپنے معاملات میں ظلم سے بچو۔ قرآن وسنت اس حقیقت سے باخبر تھے کہ انسانی عقل اپنی وسیع قابلیتوں کے باوجود حق بات تک رسائی کی غیر محدود صلاحیت کا دعویٰ نہیں کرسکتی، ان سب قابلیتوں کے باوجود اس کی کچھ حدود ہیں کہ جن کے پار وہ یا تو صحیح طریقے سے کام نہیں کرسکتی یا وہ کسی غلطی کا شکار ہوجاتی ہے، انسانی زندگی کے بہت سے حصے ایسے ہیں جہاں اکثر ''خواہشات'' پر ''عقل'' کا دھوکا ہوجاتا ہے، اور جہاں پر غیر صحت مند جبلتیں عقلی دلائل کے لبادے میں انسانیت کو غلط راہ دکھاتی ہیں، اور غیر منصفانہ کاموں کو انصاف

کی پُرفریب شکل میں ظاہر کر کے پیش کرتی ہیں، یہی وہ جگہیں ہیں جہاں پر انسانی عقل کو وحیٔ الٰہی کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہی وحیٔ الٰہی فیصلہ کرتی ہے کہ کون سا انسانی رویہ حقیقت میں ظلم کی حدود میں آتا ہے؟ چاہے وہ بات لادینی فلسفیوں کو صحیح اور مبنی برانصاف نظر آتی ہو، بالکل اسی موقع پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک مخصوص حکم آجاتا ہے جو متضاد نظریات کی طرف سے دیئے ہوئے عقلی دلائل پر فوقیت رکھتا ہے۔ بالکل یہی صورتِ حال ربا کے معاملے کے ساتھ بھی پیش آئی کہ لادین فلسفی اپنے اس نظریے پر بالکل مطمئن تھے کہ سود بالکل برحق اور مبنی برانصاف ہے، کیونکہ وہ آمدنی جو سود کے ذریعے کماتے ہیں وہ اس آمدنی کے بالکل مشابہ ہے جو وہ خرید وفروخت کے ذریعے کماتے ہیں، چنانچہ انہوں نے ربا کی حرمت کی مخالفت اسی دلیل کی وجہ سے کی جس کا ذکر قرآنِ پاک میں ان الفاظ سے کیا گیا ہے:-

اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا۔ (۲:۲۷۵)

ترجمہ:- خرید وفروخت تو ربا کی مانند ہے۔

۱۲۷:- ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر عقدِ بیع میں کسی قسم کے نفع کا مطالبہ صحیح اور مبنی برانصاف ہے تو اس بات کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ عقدِ قرض میں سود کے مطالبے کو ناجائز اور ظلم کہا جائے۔ ان کی اس دلیل کے جواب میں قرآنِ پاک خالص منطقی انداز میں ربا اور نفع کا فرق واضح کرسکتا تھا، اور یہ بھی واضح کرسکتا تھا کہ بیع کے اندر نفع کیوں صحیح ہے اور عقدِ قرض میں ربا کیوں صحیح نہیں ہے؟ قرآنِ کریم معیشت پر ربا کے بُرے اثرات کھول کر بیان کرسکتا تھا، لیکن یہ طریقہ استدلال ترک کردیا گیا، اور قرآنِ پاک میں اس کا آسان اور مختصر جواب مندرجہ ذیل جملے میں دے دیا گیا:-

وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (۲:۲۷۵)

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربا کو حرام قرار دیا ہے۔

۱۲۸:- اس آیت میں جو اشارہ دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ سوال کہ آیا یہ معاملات اپنے اندر ظلم کا عنصر رکھتے ہیں یا نہیں؟ اس کا فیصلہ صرف انسانی عقل پر نہیں چھوڑا گیا، کیونکہ مختلف افراد کی عقل مختلف جواب پیش کرسکتی ہے، اور خالص عقلی دلائل کی بنیاد پر کسی ایسے نتیجے تک نہیں پہنچا جاسکتا جو عالمگیر اطلاق کا حامل ہو، اسی لئے صحیح اُصول یہ ہے کہ ایک مرتبہ اگر ایک مخصوص معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام قرار دے دیا جائے تو پھر اس میں صرف عقلی وجوہات سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم اور حکمت ان حدود سے ماوراء ہے جہاں تک انسانوں کی عقل کی پہنچ ہے۔

اگر انسانی عقل ہر مسئلے پر ایک صحیح اور متفق علیہ فیصلہ پر پہنچنے کے قابل ہوتی تو پھر اس کے واسطے کسی خدائی وحی کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ انسانی معاملات سے متعلق بہت سے ایسے معاملات ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی مخصوص حکم نازل نہیں فرمایا، یہی وہ جگہ ہے کہ جہاں پر انسانی عقل اپنا کردار خوب اچھی طرح ادا کرسکتی ہے، لیکن اس پر یہ بوجھ ڈالنا دُرست نہیں کہ وہ صریح خدائی اَحکام کے حریف کا کردار ادا کرے۔

۱۲۹:- رِبا کے سیاق میں ظلم کا حوالہ دینے والی آیتِ قرآنیہ کو اسی تناظر میں پڑھنا چاہئے، اس آیت کے الفاظ یہ ہیں:-

وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَكُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوٰلِكُمۡ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ.

(۲۷۹:۲)

ترجمہ:- اور اگر تم رِبا کا دعویٰ کرنے سے توبہ کرو تو تمہارے واسطے صرف اصل سرمایہ ہے، نہ تم ظلم کرو، اور نہ تمہارے اُوپر ظلم کیا جائے۔

۱۳۰:-ظلم کا حوالہ دینے سے قبل، آیتِ قرآنیہ نے ایک اُصول بیان فرمایا

کہ کوئی شخص بھی ربا سے توبہ کا اس وقت تک دعویٰ نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ اصل سرمایہ پر ملنے والا سود چھوڑنے کا اعلان نہ کردے، تاہم وہ اپنے اصل سرمایہ کے واپس ملنے کا پورا پورا حق دار ہے، اور اس کا مقروض اسے پوری قرضے کی رقم واپس کرنے پر مجبور ہے، اب اگر وہ مقروض اصل سرمایہ ادا نہیں کرتا تو وہ قرض خواہ کے خلاف ناانصافی کر رہا ہے، اور اگر قرض خواہ مقروض سے اپنے قرضے کے اُوپر مزید رقم کا مطالبہ کر رہا ہے تو پھر وہ مقروض پر ظلم کر رہا ہے۔

۱۳۱:- اس طرح قرآنِ پاک نے ظلم کے ہونے یا نہ ہونے کا تعین کرنے کا کام فریقین کے اُوپر نہیں چھوڑا، بلکہ قرآنِ پاک نے بذاتِ خود قرضے کے معاملات میں اس بات کو متعین فرمادیا کہ کون سی صورت کس کے واسطے ظلم ہے؟ اس لئے یہ کہنا کہ رِبا کے مختلف معاملات کی حلت کا اندازہ انسانی عقل کے فیصلے کی بنیاد پر کیا جائے گا، یہ بات وحی کے مقصد کو فوت کرنے کے مترادف ہوگی، لہٰذا ناقابلِ قبول ہے۔

رِبا کی حرمت کی حکمت

۱۳۲:- اب ہم اس دلیل کے دُوسرے حصے کی طرف آتے ہیں جو یہ کہتا ہے کہ بینکوں کے تجارتی انٹرسٹ میں ظلم کا عنصر موجود نہیں ہے۔

۱۳۳:- مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں چونکہ قرآنِ کریم نے بذاتِ خود فیصلہ فرمادیا ہے کہ قرض کے معاملے میں ظلم کب پایا جاتا ہے؟ لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص رِبا کے معاملے میں ظلم کے تمام اجزاء ضرور تلاش ہی کرلے، تاہم رِبا کے اثراتِ بد سابقہ دور میں کبھی اتنے واضح نہ تھے جتنے کہ اب ہیں، انفرادی مہاجنی یا صَرفی سود میں صرف مقروض کے ساتھ ظلم ہوتا تھا، لیکن موجودہ تجارتی سود کے اثراتِ بد پوری معیشت پر پڑتے ہیں، حرمتِ رِبا کی حکمتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے لئے باقاعدہ ایک الگ جلد چاہئے، لیکن ہم مختصراً بیان کرنے کے لئے اس موضوع کو

تین پہلوؤں میں محدود کر دیتے ہیں:-

ا:- حرمت کا فلسفہ نظریاتی سطح پر۔

۲:- پیدائشِ دولت پر سود کے بُرے اثرات۔

۳:- خالص نظریاتی سطح پر ہم دو بنیادی مسائل پر بنیادی توجہ دیں گے، پہلے روپے کی ماہیت پر اور پھر دوسرے نمبر پر قرضے کے معاملے کی ماہیت پر۔

روپے کی ماہیت

۱۳۵:- ایک غلط تصور جس پر تمام سودی نظریات کی بنیاد ہے، وہ یہ ہے کہ نقدی کو سامان (جنس) کا درجہ دے دیا گیا ہے، اسی لئے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ جس طرح سامان کو اپنی اصل لاگت سے زائد نفع پر فروخت کیا جاسکتا ہے، اسی طرح نقدی کو بھی اس کی قیمتِ اسمیہ سے زائد پر فروخت کیا جانا چاہئے، یا جس طرح کوئی شخص اپنی جائیداد کو کرایہ پر چڑھا سکتا ہے اسی طرح وہ نقدی کو بھی کرایہ پر دے کر ایک مخصوص اور متعین سود یا کرایہ کما سکتا ہے۔

۱۳۶:- اسلامی اُصول اس نقطۂ نظر کی حمایت نہیں کرتے، نقدی اور جنس (سامان) میں اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بڑا فرق ہے، اس لئے اسلام میں دونوں کے ساتھ معاملہ بھی الگ الگ کیا گیا ہے، نقدی اور سامان کے درمیان بنیادی فرق درج ذیل طریقوں سے واضح کیا جاسکتا ہے:-

(ا) نقدی کا اپنا کوئی ذاتی فائدہ اور استعمال نہیں ہے، اسے انسانی ضروریات پورا کرنے کے لئے بلاواسطہ استعمال نہیں کیا جا سکتا، اسے صرف کچھ سامان یا خدمات حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اس کے برعکس سامان کی اپنی افادیت ہوتی ہے، اسے ذریعۂ مبادلہ بنائے بغیر بھی استعمال کر کے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔

(۲) اشیاء یا سامان مختلف اوصاف کے ہو سکتے ہیں، جبکہ نقدی میں اوصاف

کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، نقدی کے تمام اجزاء برابر مالیت کے سمجھے جاتے ہیں، مثلاً ایک ہزار روپے کا میلا کچیلا اور پرانا نوٹ وہی مالیت رکھتا ہے جو کہ بالکل نیا نویلا ایک ہزار روپے کا نوٹ رکھتا ہے۔

(۳) سامان کی خرید و فروخت کسی متعین اور شناخت شدہ چیز سے متعلق ہوتی ہے، مثلاً زید بکر سے ایک کار اشارے کے ذریعے متعین کر کے خریدتا ہے، تو اب زید اُسی کار کے لینے کا حق دار ہے جو اشارہ کر کے متعین کی گئی تھی، بیچنے والا اسے کوئی دُوسری کار لینے پر مجبور نہیں کرسکتا، خواہ وہ انہی خصوصیات کی حامل ہو۔

اس کے برخلاف رقم کسی خرید و فروخت کے معاملے میں اشارے کے ذریعہ متعین نہیں کی جاسکتی، مثلاً زید نے بکر سے ایک چیز ایک ہزار کا مخصوص نوٹ دِکھلاکر خریدی، جب ایک ہزار کی ادائیگی کا وقت آیا تو اسے اختیار ہے کہ وہ اس کی جگہ کوئی دُوسرا ایک ہزار کا نوٹ بکر کو دے دے۔

۱۳۷:- مذکورہ بالا وجوہات کی بناء پر شریعتِ اسلامیہ نے خصوصاً مذکورہ دو باتوں میں نقدی کا حکم سامان سے الگ رکھا ہے۔

۱۳۸:- پہلا یہ کہ ایک ہی جنس کی نقدی کو تجارت کا موضوع نہیں بنایا، بلکہ اس کے استعمال کو اس کے بنیادی مقصد تک محدود کردیا گیا ہے، اور وہ بنیادی مقصود یہ ہے کہ وہ ذریعۂ تبادلہ (Medium of Exchange) یا قدر کی پیمائش (Measure of Value) کے طور پر کام کرے۔

۱۳۹:- اگر استثنائی حالات میں نقدی کا تبادلہ نقدی سے کرنا ہی پڑے یا اسے قرض لیا جارہا ہو تو دونوں طرف کی ادائیگی برابر ہونی چاہئے تاکہ اسے اس کے لئے استعمال نہ کیا جاسکے جس کے واسطے اسے نہیں بنایا گیا، یعنی خود نقدی کی تجارت کرنا۔

۱۴۰:- اسلامی تاریخ کے مشہور فقیہ اور فلسفی امام غزالیؒ (متوفی ۵۰۵ھ) نے

نقدی کی ماہیت کے بارے میں اس قدیم زمانے میں تفصیل سے بحث کی جبکہ نقدی کے بارے میں مغربی نظریات وجود میں بھی نہ آئے تھے، وہ فرماتے ہیں:-

درہم اور دینار کی تخلیق خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت ہے، یہ ایسے پتھر ہیں جن کی اپنی ذاتی افادیت نہیں ہے، لیکن تمام انسان اس کے محتاج ہیں، کیونکہ ہر شخص اپنے کھانے پینے اور لباس وغیرہ کے لئے بہت سی اشیاء کا محتاج ہے، اور اکثر اوقات انسان کے پاس وہ اشیاء نہیں ہوتیں جن کی اسے ضرورت ہوتی ہے، اور وہ اشیاء ہوتی ہیں جن کی اسے ضرورت نہیں ہوتی، اسی لئے تبادلے کے معاملات ضروری ہیں، البتہ ایک ایسا آلۂ پیمائش ہونا چاہئے کہ جس کی بنیاد پر قیمت کا تعین کیا جائے، کیونکہ اشیاء کا تبادلہ ایک ہی جنس اور قسم میں نہیں ہوتا، اور نہ ہی ایک پیمائش سے ہوتا ہے، کہ وہ متعین کرسکے کہ کتنی مقدار کی ایک شے دوسری شے کی صحیح قیمت ہے، اسی لئے یہ تمام اشیاء اپنی صحیح قدر جانچنے کے لئے کسی درمیانی واسطے کی محتاج ہیں ...... اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی لئے درہم اور دینار کو تمام اشیاء کی قدر جانچنے کے لئے ایک واسطہ بنایا ہے، اور ان کا آلۂ قدر ہونا اس حقیقت پر مبنی ہے کہ وہ بذاتِ خود کوئی سامان نہیں ہیں، اگر وہ بذاتِ خود کوئی سامان ہوتے تو کوئی شخص انہیں رکھنے کا کوئی مخصوص مقصد رکھتا، جو انہیں اس کی نیت کی وجہ سے اہمیت دے دیتا، جبکہ کوئی دوسرا ان کا کوئی مخصوص مقصد نہ ہونے کی بناء پر انہیں اتنی اہمیت نہ دیتا، جس کی وجہ سے پورا نظام خراب ہوجاتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا فرمایا تاکہ وہ لوگوں کے درمیان گردش کریں اور

مختلف اشیاء کے درمیان منصف کا کام دیں، اور وہ دُوسری اشیاء کے تبادلے اور حصول کے لئے ایک ذریعے کا کام دیں، چنانچہ جو شخص ان کا مالک ہے گویا وہ ہر چیز کا مالک ہے، اس کے برخلاف اگر کوئی شخص ایک کپڑے کا مالک ہے تو وہ صرف ایک کپڑے کا مالک ہے، اسی لئے اگر اسے غذا کی ضرورت ہے تو اس بات کا امکان ہے کہ غذا کا مالک اپنی غذا کو اس کے کپڑے سے تبادلہ کرنے میں کوئی دِلچسپی نہ رکھتا ہو، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ مثال کے طور پر اسے کپڑے کے بجائے جانور کی ضرورت ہو۔ اسی لئے کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی کہ جو بظاہر خود کچھ نہ ہو لیکن اپنی رُوح کے لحاظ سے سب کچھ ہو، ایک ایسی شے جو کوئی مخصوص شکل نہیں رکھتی، دُوسری اشیاء کی نسبت سے مختلف شکلیں رکھ سکتی ہے، مثلاً آئینہ جس کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہوتا لیکن وہ ہر رنگ کی عکاسی کرتا ہے، بالکل یہی حال نقدی کا بھی ہے، کہ وہ بذاتِ خود کوئی سامان یا شے نہیں ہے، لیکن یہ ایسا آلہ ہے جو تمام اشیاء کے حصول کا سبب بنتا ہے۔

چنانچہ اگر کوئی شخص جو نقدی کو اس طرح استعمال کر رہا ہو جو کہ اس کے بنیادی مقصد کے خلاف ہو تو وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ناشکری کر رہا ہے، نتیجتاً اگر کوئی شخص نقدی کی ذخیرہ اندوزی کر رہا ہے تو وہ اس کے ساتھ ناانصافی اور اس کے بنیادی مقصد کو تلف کر رہا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی حاکم کو قیدخانے میں بند کردے۔

اور جو شخص نقدی پر سودی معاملات کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ

کی رحمت کو ٹھکرا رہا ہے اور ناانصافی کر رہا ہے، کیونکہ نقدی کو دُوسری اشیاء کے لئے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ خود اپنے لئے۔ چنانچہ جو شخص نقدی کی تجارت کر رہا ہے تو اس نے اس کو ایک شے یا سامان بنادیا ہے جو کہ اس کی اصل خلقت کی حکمت کے خلاف ہے، کیونکہ یہ ناانصافی ہے کہ پیسے کو اس مقصد کے علاوہ کسی اور کام میں استعمال کیا جائے کہ جس کے واسطے اسے پیدا کیا گیا، اب اگر اسے اس بات کی اجازت دے دی جائے کہ وہ پیسے کی تجارت کرے تو پیسہ ہی اس کا آخری مقصد بن جائے گا، اور وہ اسی کے پاس ذخیرہ شدہ نقدی کی مانند پڑا رہے گا، اور حاکم کو قید کرنا یا ایلچی کو پیغام دینے سے روکنا ظلم کے سوا کچھ نہیں۔[1]

۱۴۱:- نقدی کی حقیقت کے بارے میں امام غزالیؒ کا یہ مختصر مگر جامع تجزیہ جو نو سو سال پہلے کیا گیا تھا، وہ معاشی مفکرین صحیح تسلیم کر رہے ہیں جو ان کے کئی صدیوں بعد آئے ہیں، اس بات پر کہ پیسہ صرف آلۂ تبادلہ اور آلۂ پیمائشِ قدر ہے، پوری دُنیا کے تمام معاشی مفکرین کا اجماع نظر آتا ہے، لیکن بدقسمتی سے بہت سے معاشی مفکرین اس تصور کے اس منطقی نتیجے تک پہنچنے میں ناکام رہے، جو امام غزالیؒ نے اتنی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، یعنی یہ کہ پیسہ کی سامان کی طرح تجارت نہیں کرنی چاہئے، روپے کو جنس (عروض) قرار دے کر موجودہ معیشت دان اس قدر پریشان کن مسائل میں گرفتار ہوچکے ہیں کہ جن سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے، عروض کی عموماً دو قسمیں بیان

---

(۱) یہ امام غزالی رحمہ اللہ کی مشہور کتاب ''احیاء العلوم'' ج:۴ ص:۸۸ طبع قاہرہ ۱۹۳۹ء کی ایک مفصل بحث کا ملخص ترجمہ ہے، انہوں نے اس بات کو مزید بیان فرمایا ہے کہ نقدی کی خرید و فروخت کی حرمت کا اطلاق صرف اس وقت ہوگا جب وہ ایک جنس کی ہو، البتہ مختلف کرنسیوں میں یہ جائز ہے، انہوں نے ان دونوں صورتوں کے درمیان فرق بھی بیان فرمایا ہے۔

کی جاتی ہیں، ان میں سے پہلی کو صَرفی اشیاء اور دوسری اعلیٰ قسم کو پیداواری اشیاء کہا جاتا ہے، چونکہ نقدی بذاتِ خود اپنی کوئی افادیت نہیں رکھتی، لہٰذا اسے صَرفی اشیاء میں تو شامل نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا بہت سے معاشی مفکرین کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ اسے پیداواری اشیاء میں شامل کرتے، لیکن اسے پیداواری اشیاء میں شامل کرنے کے ثبوت پر منطقی دلائل پیش کرنا انتہائی مشکل کام ہے، موجودہ صدی کا مشہور معیشت دان لڈوِگ وان مائسیس نے اس موضوع پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا ہے، وہ کہتا ہے:-

> آخرکار اگر ہم معاشی اشیاء کو صرف دو اقسام پر منحصر کردیں تو پھر ہمیں نقدی کو ان دونوں میں سے کسی ایک قسم میں شامل کرنا پڑے گا، یہی صورتِ حال اکثر معیشت دانوں کی ہے اور چونکہ یہ بالکل ناممکن نظر آتا ہے کہ نقدی کو صَرفی اشیاء میں شمار کیا جائے، لہٰذا اسے پیداواری اشیاء میں شمار کرنا پڑے گا۔"[1]

۱۴۲:- اس نقطۂ نظر پر بہت سے دلائل ذکر کرنے کے بعد مصنفِ مذکور اپنا درج ذیل تبصرہ فرماتے ہیں:-

> یہ بات سچ ہے کہ بہت سے معیشت دانوں نے نقدی کو پیداواری اشیاء میں شمار کیا ہے، لیکن ان سب کے باوجود ان کے دلائل غلط ہیں، کسی نظریے کا ثبوت خود اس کی عقلی وجوہات پر ہوتا ہے، نہ اس کی کہ اس کی پشت پناہی پر، اور ان تمام مقتداؤں کے پورے احترام کے ساتھ یہ کہنا ضروری ہے کہ وہ اس معاملے میں اپنے نقطۂ نظر کو صحیح طرح سے ثابت نہیں کرسکے ہیں۔

۱۴۳:- آخرکار انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس نقطۂ نظر کے تحت وہ اشیاء جو

(1) Ludwig Von Misses: "The Theory of Money and Credit" Liberty Classic Indianapolis, 1980, P. 95.

نقدی کہلاتی ہیں درحقیقت بقول آدم اسمتھ کے مردہ اشیاء ہیں، جو کچھ بھی تیار (Produce) نہیں کرتیں۔

۱۴۴:- مصنف مذکور نے اپنا رُجحان ''کین'' (Kien) کے نظریے کی طرف ظاہر کیا ہے کہ نقدی نہ تو صَرفی اشیاء میں داخل ہے، اور نہ ہی پیداواری اشیاء میں، بلکہ یہ درحقیقت تبادلہ کا ایک آلہ اور ذریعہ ہے۔

۱۴۵:- اس تحقیق کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نقدی کو ایسا آلہ نہیں سمجھنا چاہئے جو روزانہ پیداوار کی بنیاد پر مزید نقدی پیدا کرے، اور نہ اسے اس وقت قابلِ تجارت چیز سمجھنا چاہئے، جبکہ اس کو اسی جنس کی کسی دُوسری نقدی کے ساتھ مبادلہ کیا جارہا ہو، کیونکہ جب ایک مرتبہ یہ بات تسلیم کی جاچکی ہے کہ نقدی نہ تو صَرفی اشیاء میں داخل ہے اور نہ ہی پیداواری اشیاء میں داخل ہے، بلکہ وہ صرف آلۂ تبادلہ ہے، تو پھر اسے قابلِ نفع تجارتی شے بنانے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، ورنہ یہ لازم آئے گا کہ صلح کرانے والا یا فیصلہ کرنے والا ازخود ایک فریق بن بیٹھا، لیکن شاید کہ سودی مالیاتی نظام کے بہت زیادہ رائج ہونے کی وجہ سے اکثر معیشت دان مزید اس رُخ کی طرف نہیں چلے۔

۱۴۶:- دُوسری طرف امام غزالیؒ نے آلۂ تبادلہ ہونے کے تصوّر کو اپنے منطقی انجام تک پہنچادیا، چنانچہ انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جب ایک نقدی کو دُوسری اس جنس کی نقدی سے تبادلہ کیا جائے تو پھر اُسے کبھی بھی نفع پیدا کرنے والا آلہ نہیں سمجھنا چاہئے۔

۱۴۷:- قرآنِ کریم اور سنت کے واضح اَحکامات کی تائید کے ساتھ امام غزالیؒ کے اس نقطۂ نظر کو اُن معاشروں کے حقیقت پسند اسکالرز اور محققین نے بھی تسلیم کیا ہے جہاں پر سود کا غلبہ ہے، ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنے اُس مالیاتی نظام کی بدحال کا سامنے کرنے کے بعد جو نقدی کی تجارت پر مبنی تھا، اس بات کو تسلیم کرلیا

کہ ان کی معاشی بدحالی کی وجہ بشمول اور وجوہات کے یہ تھی کہ وہاں نقدی کا استعمال اپنے بنیادی فعل یعنی آلۂ تبادلہ ہونے تک محدود نہ تھا۔

۱۴۸:- ۱۹۳۰ء کی خوفناک کساد بازاری کے دوران جنوری ۱۹۳۳ء میں ساؤتھ ھمپٹن کے ایوانِ تجارت نے معاشی بحران کی ایک کمیٹی تشکیل دی، کمیٹی دس ارکان پر مشتمل تھی، جس کی صدارت E. Denis Mandi کر رہے تھے، اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں ان بنیادی وجوہات کی نشاندہی کی ہے جو قومی اور بین الاقوامی معاشی بدحالی اور بحران کا سبب بنی تھیں، اور ان مسائل پر قابو پانے کے لئے مختلف تجاویز پیش کی ہیں، اس میں انہوں نے موجودہ مالیاتی نظام کے اندرونی خطرات کا تذکرہ کرنے کے بعد اپنی کمیٹی کی تجاویز میں سے ایک تجویز یہ بھی دی کہ:-

> اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ نقدی آلۂ تبادلہ وتقسیم کی اپنی حقیقی ذمہ داری صحیح طرح ادا کر رہی ہے، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عروض اور اشیاء کے طور پر تجارت بالکل بند کر دی جائے۔"[1]

۱۴۹:- نقدی کی یہ حقیقی ماہیت جس کو مالیاتی نظام کے بنیادی اُصول کے طور پر تسلیم کیا جانا چاہئے تھا، کئی صدیوں تک نظرانداز کی جاتی رہی، لیکن اب موجودہ معیشت دان بڑی تیزی کے ساتھ اس نظریے کو تسلیم کر رہے ہیں، چنانچہ پروفیسر جان گرے (آکسفورڈ یونیورسٹی) اپنی حالیہ تحقیقی کتاب "False Dawn" (جھوٹی صبح) میں درج ذیل تبصرہ کرتے ہیں:-

> سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ غیرملکی کرنسی کے تبادلے کی مارکیٹ کی مالیت ۱.۲ ٹریلین ڈالرز روزانہ کی حیرت ناک حد تک

(1) The report of Economic Crises Committee "Southampton Chamber of Commerce. 1933 part 3. (iii) Para 2, (with thanks to Mr. P.M Pidcock. Director Institute of Rational Economics, who very kindly provided us with a copy of the report.)

پہنچ چکی ہے، جو کہ دُنیا کی تجارت کی سطح سے ۵۰ گنا زائد ہے، ان میں سے تقریباً ۹۵ فیصد معاملات سٹے کی نوعیت کے ہیں، ان میں سے بہت سے فیوچرز (مستقبلیات) اور اوپشنز (خیارات) پر مبنی تمویلی معاملات سے متعلق ہیں، مائیکل البرٹ (Michael Albert) کے مطابق غیر ملکی کرنسی کے تبادلے کے معاملات کے روزانہ سودے تقریباً ۹۰۰ بلین امریکی ڈالرز ہیں جو کہ فرانس کی سالانہ مجموعی پیداوار کے مساوی ہے، اور ساری دُنیا کے مرکزی بینکوں کے مجموعی زرِمبادلہ کے ذخائر سے دوسو ملین ڈالرز زیادہ ہے۔

یہ تمویلی معیشت بنیادی اور حقیقی معیشت کو نقصان پہنچانے کا بہت بڑا خدشہ رکھتی ہے، جیسا کہ ۱۹۹۵ء میں برطانیہ کے قدیم ترین بینک بارنگس (Barings) کے زوال کا مشاہدہ کیا جاچکا ہے۔[1]

برسبیل تذکرہ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مشتقات[2] (Derivatives) کا حجم جان گرے (John Gray) نے روزانہ معاملات کی بنیاد پر بیان کیا ہے، تاہم اس کی مجموعی مالیت بہت زیادہ ہے، رچرڈ تھامس نے اپنی کتاب "Apocalypse Roulette" میں درج ذیل بات بیان کی ہے:-

تمویلی مشتقات جن کی ابتداء ۱۹۷۰ء میں ہوئی تھی ان کی ۱۹۹۶ء

(1) John Gray, False Dawn: The Delusions of Capitalism Grunte Books, London, 1998. P. 62, based on Wall Street Journal 24 October 1995. Bank of International Settlements, annual reports 1995 and Michael Albert Capitalism - original capitalism, London Whurr Publishers 1993 P.188.

(۲) ان سے مراد ایسے دستاویزات سرٹیفکیٹس ہوتے ہیں جن کی پشت پر سوائے چانس یا حق کے کچھ نہیں ہوتا۔

تک کی صنعت ۲۴ ٹریلین امریکی ڈالرز تک پہنچ چکی تھی، آپ اتنے بڑے عدد کا کیسے تصور کر سکتے ہیں؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر آپ ان تمام ڈالرز کو ایک سرے سے دُوسرے سرے تک پھیلا دیں تو یہ یہاں سے سورج تک کے فاصلے کا ساٹھ گنا زیادہ فاصلہ ہے، یا یہاں سے چاند تک پچیّس ہزار نو سو (۲۵۹۰۰) گنا زیادہ فاصلہ ہوگا۔

۱۵۰:- جیمس رابرٹسن اپنی آخری تصنیف "Transforming Economic Life" میں لکھتے ہیں:-

آج کا مالیاتی اور تمویلی نظام ظالمانہ تجزیاتی طور پر تباہ کن اور معاشی لحاظ سے نامکمل ہے، ''نقد کو لازماً بڑھنا ہوگا'' کا حکم پیداوار (اور پھر صَرف) کو ضرورت سے اُونچی سطح تک لے جاتا ہے، یہ معاشی کاوشوں کا رُخ مال سے مال کی طرف اور حقیقی خدمات اور اشیاء مہیا کرنے کے خلاف موڑ دیتا ہے ..... یہ عالمگیر پیمانے پر مفید اشیاء اور خدمات فراہم کرنے کی کاوشوں کا رُخ روپے سے روپے بنانے کی طرف موڑ دیتا ہے، کئی بلین ڈالرز کے معاملات کا پچانوے فیصد روزانہ دُنیا کے اردگرد صرف ایسے تمویلی معاملات کی خاطر منتقل ہوتا ہے جس کا حقیقی معیشت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔''(1)

۱۵۱:- یہ وہی بات ہے جو اَب سے ٹھیک نو سو سال قبل امام غزالیؒ نے فرمائی تھی، اس قسم کی غیر فطری تجارت کے اثراتِ بد کا مزید تذکرہ امام غزالیؒ نے ایک

(1) James Robertson, Transforming Economic Life: A Millenial Challenge, Green Books Devon, 1998.

دُوسری جگہ ان الفاظ میں فرمایا ہے:-

ربا کو اس لئے حرام قرار دیا گیا ہے کہ یہ لوگوں کو حقیقی معاشی سرگرمی کرنے سے روکتا ہے، کیونکہ جب ایک مال دار شخص کو اُدھار یا نقد سود پر روپے کمانے کی اجازت دی جائے گی تو پھر اس کے لئے بغیر معاشی جدوجہد کی کلفتوں کے روپے کمانا آسان ہوجائے گا، اور یہ انسانیت کے حقیقی مفاد کے خلاف ہوگا، کیونکہ انسانیت کے مفاد کا تحفظ حقیقی تجارتی قابلیت صنعت کاری اور تعمیر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔(۱)

۱۵۲:- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالیؒ نے اس ابتدائی زمانے میں ہی ایسے مالیاتی حقائق کی نشاندہی فرمادی تھی جو پیداوار پر مسلط ہوکر روپے کی رسد اور حقیقی اشیاء کی رسد کے درمیان فرق (Gap) پیدا کرتے ہیں، جس کو متأخرین (بعد کے زمانے والے) افراطِ زَر کے بنیادی سبب کے طور پر بیان کرتے ہیں، یہ خطرناک نتیجہ روپے کی تجارت کی وجہ سے نکلتا ہے، جیسے پیچھے جان گرے اور جیمس رابرٹسن کے اقتباسات میں ذکر کیا گیا ہے، ہم اس پہلو پر ذرا دیر بعد غور کریں گے، لیکن جو بات اس جگہ پر اہم ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ نقدی آلۂ تبادلہ اور قدر کا پیمانہ ہونے کی وجہ سے پیداواری سامان نہیں بن سکتا، جیسا کہ نظریۂ سود میں فرض کیا گیا ہے کہ یہ روزانہ پیداوار کی بنیاد پر نفع دیتا ہے، یہ درحقیقت ایک ''ثالث'' ہے، لہٰذا اسے صرف یہی کردار ادا کرنے کے لئے چھوڑ دینا چاہئے، اسے نفع بخش سامانِ تجارت قرار دینا پورے مالیاتی نظام کو خراب کردیتا ہے، اور پورے معاشرے پر اخلاقی و معاشی مفاسد کا ایک ملغوبہ مسلط کردیتا ہے۔

(۱) الغزالی: احیاء العلوم۔

قرضوں کی اصل

۱۵۳:- موجودہ سیکولر سرمایہ داری نظام اور اسلامی اُصولوں کے درمیان ایک اور بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ داری نظام میں قرضوں کا مقصد صرف تجارتی ہوتا ہے تاکہ قرضوں کے ذریعے قرض دینے والے ایک متعین نفع کما سکیں۔ اس کے برخلاف اسلام قرضوں کو نفع کمانے کا ذریعہ قرار نہیں دیتا، اس کے بجائے ان کا مقصد یا تو انسانیت کی بنیاد پر دُوسروں کی مدد کرکے ثواب کمانا ہوتا ہے یا پھر کسی محفوظ ہاتھ میں اپنی رقم کو محفوظ کرنا ہوتا ہے۔ جہاں تک سرمایہ کاری کا تعلق ہے، اسلام میں اس کے لئے دُوسرے طریقے ہیں مثلاً شرکت وغیرہ، لہٰذا قرضوں کے عقد کے ذریعے نفع اندوزی نہیں کی جاسکتی۔

۱۵۴:- اس نقطۂ نظر کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ جو شخص کسی دُوسرے شخص کو قرضہ دیتا ہے اس کے تین مقاصد ہوسکتے ہیں:-

(۱) وہ قرضہ صرف ہمدردی کی بنیاد پر دے رہا ہے۔

(۲) وہ مقروض کو قرضہ دُوسرے ہاتھوں میں محفوظ کرنے کے لئے دے رہا ہے۔

(۳) وہ دُوسرے کو اپنا سرمایہ، لینے والے کے نفع میں شرکت کے لئے دے رہا ہے۔

۱۵۵:- ابتدائی دو صورتوں میں وہ اپنے اصل سرمایہ کے اُوپر کسی قسم کے بھی نفع کا مستحق نہیں ہے، کیونکہ پہلی صورت میں اس کے قرضہ دینے کا مقصد انسانی ہمدردی تھی، اور دُوسری صورت میں اس کا مقصد اپنی رقم محفوظ کرنا تھا، نہ کہ نفع کمانا۔

۱۵۶:- تاہم اگر اس کی نیت لینے والے کے نفع میں شرکت ہے تو پھر اسے نقصان کی صورت میں بھی شریک ہونا پڑے گا، اسے اس کے ساتھ شرکت

کا معاملہ کر کے اس کی تجارت میں حصہ دار بننا پڑے گا، اور اس کے نفع نقصان میں انصاف کے ساتھ شریک ہونا پڑے گا۔ اس کے برعکس اگر قرضے کے نفع میں شراکت کا مطلب یہ ہو کہ قرضہ دینے والا تو اپنا نفع یقینی بنالے لیکن قرض لینے والے کا نفع تجارت کے حقیقی نتائج پر چھوڑ دے، جس میں اس مقروض کا پورا بزنس تباہ ہو جائے، تو وہ اس کے نقصان کو برداشت نہ کرے، تاہم مقروض کے ذمہ قرض خواہ کو پھر بھی سود دینا پڑے، جس کا مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ کا نفع یا سود بہرحال یقینی ہے، خواہ مقروض کو تباہ کن نقصان ہی کیوں نہ اُٹھانا پڑے، یہ بات صراحۃً ظلم اور ناانصافی ہے۔

۱۵۷:- اس کے برعکس اگر مقروض کی تجارت خوب نفع کمائے تو اس صورت میں قرض دینے والے کو مناسب حصہ ملنا چاہئے، لیکن موجودہ سودی نظام میں تمویل کنندہ کا حصۂ نفع ایک قیمت پر متعین ہوتا ہے، جس کی بنیاد روپے کی طلب و رسد کی طاقتیں ہوتی ہیں نہ کہ وہ حقیقی نفع جو اس تجارت میں ہوا ہے، یہ سودی شرح اس مناسب حصۂ نفع سے بہت کم ہوسکتی ہے جس کا وہ شرکت کی صورت میں مستحق بن سکتا تھا، اس صورت میں نفع کا بیشتر حصہ مقروض کو مل گیا، جبکہ تمویل کرنے والے کو اس تناسب سے بہت کم حصہ ملا، جس تناسب سے اس کی رقم کاروبار میں لگی تھی۔

۱۵۸:- اس طرح سود پر تجارت کی فائنانسنگ (تمویل) ایک ناہموار اور غیر عادلانہ فضاء پیدا کرتی ہے، جس میں مذکورہ دو فریقوں میں سے کسی ایک فریق کے ساتھ ظلم ضرور ہوتا ہے، یہی وہ حکمت ہے جس کی وجہ سے اسلام نے سودی معاملات کو ناجائز قرار دیا ہے۔

۱۵۹:- جب ایک مرتبہ سود ممنوع قرار دے دیا جائے تو تجارتی سرگرمیوں میں قرضوں کا استعمال بہت محدود ہو جاتا ہے، اور تمویل کا پورا ڈھانچہ حصہ داری یا اثاثوں پر مبنی نظامِ تمویل کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، قرضوں کے استعمال کو محدود کرنے کے لئے شریعت نے صرف انتہائی ضرورت کے وقت قرضے لینے کو جائز قرار دیا ہے،

اور اپنے ذرائع سے یا (چادر سے باہر) اور صرف اپنی دولت میں اضافے کی خاطر قرضے لینے سے منع فرمادیا ہے، یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار فرمادیا تھا، جو مقروض ہونے کی حالت میں مرا تھا۔[1] یہ واقعہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ قرضے لینا کسی بھی انسان کو اپنی روزمرّہ زندگی کے معمول کا حصہ نہیں بنانا چاہئے، بلکہ اسے اپنی معاشی زندگی کے مسائل کا آخری حل سمجھنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ سود کو حرام قرار دیا گیا ہے کہ کوئی شخص دُوسرے کو بلاوجہ فضولیاتِ تعیش یا تجارتی منصوبوں کی تکمیل کے واسطے غیر سودی قرضے فراہم کرنے پر راضی نہیں ہوگا، جس کی وجہ سے غیرضروری اخراجات کے واسطے قرضوں کا دروازہ بند ہوجائے گا، اس کے برعکس نفع بخش تجارتوں کی تمویل منصفانہ شراکت کی بنیاد پر ڈیزائن کی جائے گی جس کی وجہ سے قرضوں کا عمل دخل ایک تنگ دائرہ تک محدود رہ جائے گا۔

۱۶۰:- اس کے برعکس اگر ایک بار سود کو جائز قرار دے دیا جائے، اور قرضہ دینا ازخود ایک تجارتی صورت اختیار کرجائے، تو پھر پوری معیشت قرضہ میں لپٹی ہوئی معیشت میں بدل جاتی ہے، جو نہ صرف یہ کہ حقیقی معاشی سرگرمیوں پر غالب آجاتی ہے، اور اپنے جھٹکوں کے ذریعے معیشت کے فطری عمل کو نقصان پہنچاتی ہے، بلکہ پوری انسانیت قرضوں کی غلامی میں چلی جاتی ہے، یہ بات کوئی راز نہیں ہے کہ آج تمام اقوامِ عالم بشمول تمام ترقی یافتہ ممالک ملکی اور غیر ملکی قرضوں کے تحت اس حد تک ڈوب چکے ہیں کہ ان میں سے اکثر ممالک پر واجب الادا رقوم ان کی مجموعی آمدنی سے کافی زیادہ ہیں۔ مثال کے طور پر صرف برطانیہ کا اندرونی قرضہ ۱۹۶۲ء میں اس کی مجموعی آمدنی کا ۳۰ فیصد تھا، جو کہ بڑھ کر ۱۹۹۷ء میں اس کی مجموعی آمدنی کا ۱۰۰ فیصد سے بھی زائد ہوگیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ برطانیہ کا اندرونی قرضہ جس کا ہر امیر و

(۱) البخاری: صحیح البخاری کتاب نمبر ۳۹ باب: ۳ حدیث: ۲۲۹۵۔

غریب کو سامنا ہے، اس ملک کی مجموعی سالانہ آمدنی سے زائد ہے۔ صارفین نے اپنی مستقبل کی آمدنی کی بنیاد پر آج قرضے بھی لئے اور خریداریاں بھی کیں، جو کہ ان کی پوری سالانہ آمدنی سے کافی زیادہ ہیں، (1) پیٹروار برٹسن جن کا شمار انتہائی مؤقر مالیاتی مبصرین میں ہوتا ہے اور جنہوں نے ماضی میں معاشی پیش گوئیوں کا انعام جیتا تھا، وہ ان الفاظ میں اس حالت پر تبصرہ کرتے ہیں:-

> The Credit and capital markets have grown too rapidly, with too little transparency and accountability. Prepare for an explosion that will rock the western financial system to its foundation.
>
> ترجمہ:- قرضوں اور بازار سرمایہ نے اتنی زیادہ تیزی اور اتنی کم شفافیت اور اتنے کم احتساب کے ساتھ یہ ترقی کی ہے کہ اب ایک ایسے دھماکے کے لئے تیار ہوجانا چاہئے جو کہ مغربی مالیاتی نظام کو اس کی جڑ سے اُکھاڑ دے گا۔

سود کے مجموعی اثرات

۱۶۱:- سودی قرضوں کا دائمی رُجحان یہ ہے کہ وہ مال داروں کو فائدہ اور عام آدمیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں، یہ پیدائشِ دولت، وسائل کی تخصیص اور تقسیمِ دولت پر بھی منفی اثرات لاتے ہیں، ان میں سے چند اثرات ذیل میں درج ہیں:-

(الف) وسائل کی تخصیص (Allocation of Resources) پر اثراتِ بد

۱۶۲:- موجودہ بینکاری نظام میں قرضے زیادہ تر ان لوگوں کو دیئے جاتے ہیں جو مال و دولت کے لحاظ سے خوب مضبوط ہوتے ہیں اور وہ ان قرضوں کے لئے

(1) Source: OECD structural indicators 1996, Bank of England and council for Mortgage lenders statistics as quoted by Michael Rowbotham in "The Grip of Death", Jon Carpenter Publishing, England.

آسانی کے ساتھ رہن (Collatoral) مہیا کر سکتے ہیں، ڈاکٹر عمر چھاپرا جو اس مقدمے میں بطور عدالتی مشیر تشریف لائے تھے، انہوں نے ان اثرات کو درج ذیل الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا ہے:-

Credit, therefore, tends to go to those who, according to Lester Thurow, are lucky rather than smart or meritocratic.[1] The banking system thus tends to reinforce the unequal distribution of capital.[2] Even Morgan Guarantee Trust Company, sixth largest bank in the U.S. has admitted that the banking system has failed to finance either maturing smaller companies or venture capitalist and though a wash with funds is not encouraged to deliver competitively priced funding to any but the largest, most cash-rich companies.[3] Hence while deposits come from a broder cross-section of the population, their benefit goes mainly to the rich.

(Dr. Chapra's written statement under the caption "Why has Islam Prohibited Interest?" P. 18)

ترجمہ:- اسی لئے قرضے لیسٹر تھرو کے قول کے مطابق ان لوگوں کو دیئے جاتے ہیں جو خوش قسمت ہوں، نہ کہ وہ جو حاجت مند اور مستحق ہوں، اسی لئے موجودہ بینکاری نظام تقسیم دولت کا غیر عادلانہ نظام مسلط کرتا ہے، یہاں تک کہ مورگن گارنٹی ٹرسٹ کمپنی جو امریکا کا چھٹا سب سے بڑا بینک ہے، اس نے یہ تسلیم

(1) Through. Lester. Zero - Sun Society. New York: Basic Books 1980, P. 175.
(2) Bigsten. arne, poverty, inequality and Development, in Norman Gemmel, surveys in development Economics. Oxford: Blackwell, 1987, P. 156.
(3) Morgan Guarantee Trust Company of New York, world financial market, Jan 1987, P. 7.

کیا ہے کہ بینکاری نظام ان لوگوں کو تمویل کرنے میں ناکام رہا ہے جو چھوٹی کمپنیاں ہوں یا شراکت داری کرنا چاہتی ہوں، اور بینکوں کے سرمایہ کی زیادتی بھی انہیں صرف ان کمپنیوں کو تمویل کرنے پر ہی اُبھارتی ہے جن کے پاس بہت زیادہ مال ہوتا ہے، لہٰذا اگرچہ بینکوں کی زیادہ تر آمدنی آبادی کی اکثریت سے آتی ہے لیکن اس کا فائدہ مجموعی طور پر مال دار لوگ ہی اُٹھاتے ہیں۔

(ڈاکٹر چھاپرا کا تحریری بیان بعنوان ''اسلام نے سود کو کیوں حرام قرار دیا؟'' ص:۱۸)

۱۶۳:- مندرجہ بالا اقتباس کی سچائی کا اندازہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی ستمبر ۱۹۹۹ء کی شماریاتی رپورٹ میں کیا جاسکتا ہے کہ کل ۲۱ لاکھ ۸۴ ہزار ۴ سو ستر (۲,۱۸۴,۴۱۷) کھاتے داروں میں سے صرف نو ہزار دو سو انہتر (۹,۲۶۹) افراد (جو کہ مجموعی کھاتوں کا ۰٫۴۲۴۳ فیصد ہیں) نے ۴۳۸٫۶۷ بلین روپے کا فائدہ اُٹھایا جو ۱۹۹۸ء کے دسمبر کے اخیر تک مجموعی تمویلات کا ۶۴٫۵ فیصد حصہ ہیں۔

(ب) پیداوار پر بُرے اثرات

۱۶۴:- چونکہ سود پر مبنی نظام میں سرمایہ مضبوط رہن گروی (Collateral) کی بنیاد پر فراہم کیا جاتا ہے، اور فنڈز کا استعمال تمویل کے لئے کسی قسم کا بنیادی معیار قائم نہیں کرتا، اسی واسطے یہ لوگوں کو اپنے وسائل کے پار رہنے کے لئے مجبور کرتا ہے، مال دار لوگ صرف پیداواری مقاصد کے لئے قرضے نہیں لیتے، بلکہ عیاشانہ خرچوں کے لئے بھی قرضے لیتے ہیں۔

اسی طرح حکومت صرف حقیقی ترقیاتی پروگرام کے لئے قرضے نہیں لیتی، بلکہ فضول اخراجات اور اپنے ان سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے بھی قرضے لیتی ہے، جو

صحت مند معاشی فیصلوں پر مبنی نہیں ہوتے، منصوبوں سے غیر مربوط (Non-Project -related) قرضے جو کہ صرف سود پر مبنی نظام میں ہی ممکن ہیں، ان کا فائدہ قرضوں کے سائز کو خطرناک حد تک بڑھانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ۱۹۹۸ء سے ۱۹۹۹ء کے بجٹ کے مطابق ہمارے ملک کے ۴۶ فیصد اخراجات صرف قرضوں کی ادائیگی میں صَرف (خرچ) ہوئے، جبکہ صِرف ۱۸ فیصد ترقیات پر لگے، جن میں تعلیم، صحت اور تعمیرات شامل ہیں۔

(ج) اثراتِ بد تقسیمِ دولت پر

۱۶۵:- ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جب تجارت کو سود کی بنیاد پر فائنانس (تمویل) کیا جائے تو وہ یا تو یہ سود پر مبنی تمویل اس وقت مقروض کو مزید نقصان پہنچاتی ہے جب وہ تجارتی خسارے کا شکار ہو یا قرض دینے والے کو نقصان پہنچاتی ہے اگر مقروض اس سے عظیم نفع کمائے، سودی نظام میں مذکورہ دونوں صورتیں مساوی طور پر ممکن ہیں، اور اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں کہ جس میں سود کی ادائیگی نے چھوٹے تاجروں کو تباہ کر دیا ہے، لیکن ہمارے موجودہ بینکاری نظام میں تمویل کرنے والے (Financier) کے ساتھ ہونے والا ظلم کہیں زیادہ ہے، اور اس کی وجہ سے تقسیمِ دولت کا نظام بہت بُری طرح متاثر ہوا ہے۔

۱۶۶:- موجودہ بینکاری نظام میں بینک ہی کھاتہ داروں کا سرمایہ بڑے بڑے تاجروں کو فراہم کرتے ہیں، تمام بڑے تجارتی منصوبوں کی تمویل بینکوں یا مالیاتی اداروں کے ذریعے ہی ہوتی ہے، متعدّد حالات میں تاجروں کا اپنی جیب سے لگایا ہوا سرمایہ اس سرمایہ کے مقابلے میں بہت کم ہوتا ہے جو انہوں نے عوام کا سرمایہ بینکوں اور مالیاتی اداروں سے قرض کی صورت میں لیا ہوا ہوتا ہے، اگر ایک تاجر کا اپنا سرمایہ صرف دس ملین ہو تو وہ نوّے ملین بینک سے لے کر عظیم نفع بخش تجارت شروع کر دیتا

ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ نوے فیصد پروجیکٹ کھاتہ داروں کے وسائل سے اور دس فیصد خود اس کے اپنے وسائل سے شروع کیا گیا ہے، اگر یہ عظیم پروجیکٹ بہت زیادہ نفع کمائے تو اس کا بہت تھوڑا سا تناسب جس کی حدود مختلف ممالک میں ۲ فیصد سے ۱۰ فیصد تک ہوتی ہیں، اُن کھاتہ داروں کو ملتی ہے جن کی سرمایہ کاری اس منصوبے میں ۹۰ فیصد تھی، جبکہ بقیہ سارا نفع وہ تاجر لے جاتا ہے جس کا سرمایہ صرف ۱۰ فیصد لگا ہوا ہوتا ہے، اور پھر یہ تھوڑی رقم جو کہ کھاتہ داروں کو دی گئی ہوتی ہے، واپس انہی بڑے بڑے تاجروں کی جیب میں چلی جاتی ہے، کیونکہ وہ تمام رقم جو انہوں نے سود کی شکل میں ادا کی تھی وہ اپنی پیداوار کے اخراجات میں شامل کردی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس پیداوار (Product) کی قیمت میں اضافہ ہوجاتا ہے جس کا صافی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام بڑی بڑی تجارتوں کا نفع صرف ان لوگوں نے کمایا جن کی خود اپنی سرمایہ کاری ۱۰ فیصد سے زائد نہ تھی، جب کہ جن لوگوں کی سرمایہ کاری ۹۰ فیصد تھی انہوں نے درحقیقت کچھ نہ کمایا، کیونکہ انہیں سود کی شکل میں جو کچھ نفع ملا تھا اسے اس پیداوار کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے واپس انہی تاجروں کو ادا کرنا پڑ گیا، بلکہ بہت سی صورتوں میں ان کا نفع حقیقی معنوں میں منفی ہوگیا۔

۱۶۷:- جب اس صورتِ حال کو اس حقیقت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے جسے پیچھے بھی ذکر کیا گیا تھا کہ مجموعی تمویلات کا ۶۴٫۵ فیصد صرف ۰٫۲۲۴۳ فیصد کھاتہ داروں کو دیا گیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کئی لاکھ (ملینز) افراد کی رقوم سے صرف نو ہزار دو سو انہتر (۹,۲۶۹) افراد نے فائدہ اُٹھایا، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں موجود تقسیمِ دولت کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں میں اس قسم کی تمویلات نے کتنا بڑا کردار ادا کیا ہے، بہ نسبت اس پرانے صَرفی سود کے جو چند افراد پر انفرادی طور پر ظلم کرتا تھا، اس جدید تجارتی سود نے پورے معاشرے کے ساتھ مجموعی طور پر کس قدر زبردست ظلم کیا ہے۔

۱۶۸:- موجودہ سودی نظام کس طرح امیروں کے لئے کام کرتا ہے؟ اور کس طرح غریبوں کو مار دیتا ہے؟ یہ بات جیمس رابرٹسن نے درج ذیل الفاظ میں بیان کی ہے:-

The pervasive role of interest in the economic system results in the systematic transfer of money from those who have less to those who have more. Again, this transfer of resourced from poor to rich has been made shockingly clear by the Third World debt crisis. But it applies universally. It is partly because those who have more money to lend, get more in interest than those who have less; it is partly because the cost of interest repayments now forms a substantial element in the cost of all goods and services, and the necessary goods and services looms much larger in the finances of the rich. When we look at the money system that way and when we begin to think about how it should be redesigned to carry out its functions fairly, and efficiently as part of an enabling and conserving economy, the arguments for an interest-free inflation-free money system for the twenty-first century seems to be very strong.[1]

ترجمہ:- سود کا ایک عام کردار معاشی نظام میں یہ ہوتا ہے کہ یہ خودکار طریقے سے غریب سے امیر کی طرف سرمایہ کے انتقال کا سبب بنتا ہے، اور پھر غریب سے امیر کی طرف انتقالِ سرمایہ تیسری دُنیا کے ممالک کے قرضوں کے ذریعے اور بھی زیادہ

(1) James Roberson, Future Wealth: A new Economics for the 21st Century, Cassell Publications, London 1990, P. 131.

چونکادینے کی حد تک واضح ہوگیا ہے، لیکن یہ اُصول پوری دُنیا میں لاگو ہوتا ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جو لوگ قرض دینے کے لئے زیادہ سرمایہ رکھتے ہیں وہ ان لوگوں کے مقابلے میں سود زیادہ کماتے ہیں کہ جو لوگ کم سرمایہ رکھتے ہیں، نیز اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سود کی ادائیگی کے اخراجات کا بہت بڑا اثر تمام سامان اور خدمات کی قیمتوں پر پڑتا ہے جس کی وجہ سے ضروری اشیاء بھی کافی گراں معلوم ہونے لگتی ہیں، اگر ہم کبھی نظامِ سرمایہ پر غور کرتے ہیں کہ کب اور کس طرح ہم اس قابل ہوں گے کہ اس نظام کو دوبارہ ازسرِنو اس طرح ترتیب دیں کہ وہ نظام انصاف کے ساتھ بہترین طریقے سے چل سکے، تو پھر سود اور افراطِ زَر سے آزاد نظام کے دلائل اس ۲۱ویں صدی کے لئے بڑے مضبوط دکھائی دیتے ہیں۔

۱۶۹:- وہی مصنف ایک دُوسری کتاب میں درج ذیل بات بیان کرتے ہیں:-

انتقالِ نفع غریب سے امیر کی طرف، غریب جگہوں سے امیر جگہوں کی طرف، غریب ممالک سے امیر ممالک کی طرف، موجودہ مالیاتی اور تمویلی نظام کی وجہ سے ہے، ایک وجہ غریب سے امیر کی طرف انتقالِ سرمایہ کی سود کی ادائیگی اور وصولی ہے، جو معیشت کے اندر ایک کردار ادا کرتی ہے۔

مصنوعی سرمایہ اور افراطِ زَر کا اضافہ

۱۷۰:- چونکہ سودی قرضے حقیقی پیداوار کے ساتھ کوئی خاص ربط نہیں رکھتے، اور تمویل کرنے والا ایک مضبوط گروی حاصل کرنے کے بعد عموماً اس طرف کوئی خیال نہیں کرتا کہ اس کی رقم مقروض کہاں استعمال کر رہا ہے؟ بینکوں اور مالیاتی اداروں کے ذریعے سرمایہ کی فراہمی و رسد، ان اشیاء یا خدمات سے کوئی تعلق یا رابطہ

نہیں رکھتی جو کہ واقعات کی دُنیا میں پیدا کی گئی ہیں، اس طرح یہ صورتِ حال رسدِ سرمایہ اور پیداوارِ اشیاء و خدمات کے درمیان ایک سنگین حد تک عدمِ توازن (Mismatch) پیدا کرتی ہے، یہی درحقیقت ایک واضح وجہ ہے جو افراطِ زَر پیدا کرتی یا اسے مزید بھڑکاتی ہے۔

۱۷۱:- مذکورہ بالا صورتِ حال کو جدید بینکوں کے اُس عمل نے خوفناک حد تک بڑھادیا ہے جو عموماً ''تخلیقِ زَر'' کے نام سے مشہور ہے، معاشیات کی ابتدائی کتابیں بھی عموماً تعریفی انداز میں ذکر کرتی ہیں کہ کس طرح بینک سرمایہ تخلیق کرتے ہیں؟ بینکوں کے اس بظاہر معجزانہ کردار کو بعض اوقات افزائشِ پیداوار اور خوشحالی لانے کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا جاتا ہے، لیکن موجودہ بینکاری کے چمپئن اس تصوّر کے ذیل میں موجود خرابیوں کو بہت کم منکشف کرتے ہیں۔

۱۷۲:-تخلیقِ زَر کی تاریخ انگلستان کے زمانۂ وسطیٰ کے سناروں کے مشہور واقعہ جتنی پرانی ہے کہ لوگ ان کے پاس بطور امانت کے سونے کے سکے رکھوایا کرتے تھے، اور یہ ان کو ایک رسید دے دیا کرتے تھے، کام کی آسانی کے لئے سناروں نے بیئرر (Bearer) رسیدیں جاری کرنی شروع کردیں، جنہوں نے تدریجاً سونے کے سکوں کی جگہ لے لی، اور لوگ اپنے واجبات کی ادائیگی کے لئے انہیں استعمال کرنے لگے، جب ان رسیدوں نے بازار میں قبولیتِ عامہ حاصل کرلی تو امانت رکھوانے والوں میں سے یا ان رسیدوں کے حاملین میں سے بہت کم لوگ اصل سونے کے سکوں کا مطالبہ کرتے، اس وقت سناروں نے امانت میں رکھے ہوئے اصل سونے کے سکوں کو خفیتہً سودی قرضے پر قرض دینا شروع کردیا، اور اس طرح ان قرضوں پر سود کمانا شروع کردیا۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے اس تجربے سے یہ اخذ کیا کہ وہ اس سے زیادہ رسیدیں چھاپ سکتے ہیں جتنا ان کے پاس حقیقت میں سونا رکھا گیا ہے، اور پھر

اس زائد رقم کو بھی وہ سودی قرضے پر دے سکتے ہیں، انہوں نے یہی طریقہ اپنایا اور اس طرح ''تخلیقِ زر'' یا تھوڑا سا ریزَرو رکھ کر باقی رقم قرض پر دینے (Fractional Reserve Lending) کی ابتدا ہوگئی کہ جس کا حاصل یہ تھا کہ ریزَرو میں موجود امانت رکھوانے والوں کے سونے سے زائد قرضہ دینا، انہوں نے مزید اعتماد حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ریزَرو کم کرتے ہوئے اپنے خودساختہ قرضوں کا تناسب بڑھانا شروع کردیا، یہاں تک کہ وہ اپنے سیف میں موجود سونے سے چار پانچ بلکہ دس گنا زائد قرضے دینے لگے۔

۱۷۳:- ابتداء میں یہ سناروں کی طرف سے امانت کا غلط استعمال اور واضح دھوکا تھا، جس کی حمایت امانت، دیانت و انصاف کا کوئی اُصول نہیں کرسکتا تھا۔ اور اس طرح روپے جاری کرنا ایک قسم کی دھوکا دہی اور حکمرانی کے طاقت و اختیارات کو سلب کرکے اپنا تسلط جمانا تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہی فریبی عمل جدید بینکاری کا ''فریکشنل ریزَرو سسٹم'' کے نام سے ایک فیشن ایبل اور معیاری عمل بن گیا۔ ان صرافوں اور بینکروں نے اس تخلیق کو انگلستان اور امریکا کے حکمرانوں کی سخت مخالفت کے باوجود اس تخلیقِ زر کے عمل کو قانونی بنانے میں کس طرح کامیابی حاصل کی؟ اور روتھ چائلڈز نے پورے یورپ اور روک فیلر نے پورے امریکا میں کس طرح حاکمیت قائم کی؟ یہ ایک طویل داستان ہے،[1] جواَب پرائیویٹ بینکوں کے تخلیقِ زر کے

(۱) دلچسپی اور آنکھیں کھول دینے والی اس داستان کے مطالعے کے لئے درج ذیل کتابیں مطالعہ کی جاسکتی ہیں:-

i:- Michael Rowbotham: "The Grip of Death - A study of Modern Money", Jon Carpenter, England 1998, chapter 13 to 15.

ii:- Patric S. J Carmack and Bill Still: "The Money Masters", Royalty Production Company, USA, 1998.

iii:- William Guy Carr: "Pawns in the Game", Fla USA chapter 6.

iv:- Robert O' Priscoll and Margarita Ivan off- Dubrowsky: "The New World Order", Canada 1993.

تصور کی حمایت میں متعدد نظریات کی دھند میں گم ہوچکی ہے. لیکن خالص نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ موجودہ بینک کسی چیز کے بغیر تخلیقِ زَر کرتے ہیں، انہیں اپنے کھاتوں کے مقابلے میں دس گنا زائد قرضے دینے کی بھی اجازت ہوتی ہے، حکومت کے حقیقی اور قرضوں سے آزاد سکے اور روپے کی تعداد گردش کرنے والے مجموعی روپوں کے مقابلے میں بہت کم ہے، ان میں سے اکثر مصنوعی ہیں اور ان کو بینکوں کی تمویل (Financing) کی وجہ سے پیدا کیا گیا ہے، حکومت کے جاری کئے ہوئے حقیقی روپیہ کی تعداد روز بروز اکثر ممالک میں کم ہوتی جارہی ہے، جبکہ بینکوں کے پیدا کئے ہوئے روپے کی، جن کی پشت پر کچھ نہیں ہے، تعداد مستقل بڑھ رہی ہے، قرضوں در قرضوں کا یہ چکر اب رسدِ سرمایہ کا ایک عظیم حصہ بن چکا ہے، اور حکومت کے جاری کئے ہوئے حقیقی زَر کا تناسب اکثر ملکوں میں مسلسل گرتا چلا گیا ہے، جبکہ بینکوں نے جو بے بنیاد اور مصنوعی زَر پیدا کیا ہے اس کا تناسب مسلسل بڑھ رہا ہے۔ برطانیہ کی مثال لے لیجئے، ۱۹۹۷ء کی شماریاتی رپورٹ کے مطابق مجموعی زَر کا اسٹاک ۶۸۰ بلین پاؤنڈز تھا، جن میں سے صرف ۲۵ بلین پاؤنڈز حکومتِ برطانیہ نے سکوں اور کاغذی نوٹ کی شکل میں جاری کئے، اس کے علاوہ بقیہ ۶۵۵ بلین پاؤنڈز بینکوں کی تخلیق کے ذریعے پیدا ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجموعی رسد سرمایہ کا صرف ۳٫۶ فیصد قرضوں سے آزاد سرمایہ تھا، جبکہ بقیہ ۹۶٫۴ فیصد بینکوں کے پیدا کئے ہوئے بلبلہ یا جھاگ کے سوا کچھ نہ تھا، یہ بلبلہ سالانہ کس رفتار سے بڑھ رہا ہے؟ اس کا ملاحظہ درج ذیل نقشے سے کیا جاسکتا ہے جو برطانیہ کی رسدِ سرمایہ کی مقدار تفصیل سے بیان کرتا ہے۔

سال	حکومت کے جاری کردہ مجموعی نوٹ اور اس کے پاؤنڈز بلین کی شکل میں ذکر کئے گئے ہیں	مجموعی رسد سرمایہ اسٹرلنگ پاؤنڈز بلین	حقیقی قرض سے آزاد سرمایہ کا ٹوٹل رسد سرمایہ کے مقابلے میں تناسب
۱۹۷۷ء	۸،۱	۶۵	۱۲%
۱۹۷۹ء	۱۰،۵	۸۷	۱۲%
۱۹۸۱ء	۱۲،۱	۱۱۶	۱۰،۵%
۱۹۸۳ء	۱۲،۸	۱۶۱	۷،۹%
۱۹۸۵ء	۱۴،۱	۲۰۵	۶،۸%
۱۹۸۷ء	۱۵،۵	۲۶۹	۵،۸%
۱۹۸۹ء	۱۷،۲	۳۷۲	۴،۶%
۱۹۹۱ء	۱۸،۶	۴۸۵	۳،۸%
۱۹۹۳ء	۲۰،۰	۵۲۵	۳،۸%
۱۹۹۵ء	۲۲،۴	۵۸۵	۳،۸%
۱۹۹۷ء	۲۵،۰	۶۸۰	۳،۶%

۱۷۴:- یہ جدول[1] یہ بات واضح کرتی ہے کہ بینکوں کی تخلیق شدہ رقم دو عشروں میں اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ بڑھی کہ وہ ۱۹۹۷ء میں ۶۸۰ بلین پاؤنڈز ہوگئی۔ مذکورہ بالا جدول کا آخری کالم قرضوں سے آزاد حقیقی زر کا مجموعی رسد سرمایہ کے مقابلے میں کم ہوتا ہوا تناسب ظاہر کرتا ہے۔

۱۷۵:- یہ حقیقت دو باتیں منکشف کرتی ہے، سب سے پہلے وہ یہ بتاتی ہے کہ مجموعی رسد سرمایہ کا ۹۶،۴ فیصد قرضوں پر چڑھا ہوا سرمایہ ہے، جبکہ صرف ۳،۶ فیصد قرضوں سے آزاد سرمایہ ہے، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پوری معیشت کس طرح قرضے میں ڈوبی ہوئی ہے، دوسرے یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں

(1) Source: Bank of England Releases. 1995, 1997 as quoted by Michael Rowbortham in "The Grip of Death - A study of Modern Money", Jon Carpenter, England, 1998, P. 13.

زیرِ گردش پورے زر کا ۹۶٫۴ فیصد سوائے کمپیوٹروں کے پیدا کئے ہوئے نمبروں کے کچھ نہیں ہے، اور ان کے پیچھے کوئی حقیقی اثاثہ موجود نہیں ہے۔

۱۷۶:- امریکا کی بھی تقریباً بالکل ویسی ہی حالت ہے جیسی برطانیہ کی ذکر کی گئی ہے، پیٹرک ایس جے کارماک اور بل اسٹل درج ذیل الفاظ میں اس بات پر تبصرہ کرتے ہیں:-

> Why are we over our head in debt? Because we are laboring under a debt-money system, in which all our money is created in parallel with an equivalent quantity of debt, that is designed and controlled by private bankers for their benefit. They create and loan money at interest, we get the debt ......
>
> ..... So, although the banks do not create currency, they do create checkbook money, or deposits, by making new loans. They even invest some of this created money. In fact, over one trillion dollars of the privately-created money has been used to purchase U.S. bonds on the open market, which provides the banks with roughly 50 billion dollars in interest, less the interest they pay some depositors. In this way, through fractional reserve lending, banks create far in excess of 90 % of the money, and therefore cause over 90 % of our inflation.[1]

ترجمہ:- ہمارے سروں پر اس قدر اضافی قرضہ کیوں ہے؟ کیونکہ ہم ایک قرضی زر کے نظام میں محنت کر رہے ہیں، جس

(1) Patric S J. Carmack and Bill Still: "The Money Master, How International Bankers Gained Control of America", Royalty Production Company 1998, PP.78 79.

میں ہمارا تمام سرمایہ قرض کے مساوی اور متوازی پیدا کیا گیا ہے، اور اسے پرائیویٹ بینک اپنے منافع کے لئے ڈیزائن اور کنٹرول کرتے ہیں، وہ سرمایہ پیدا کرتے ہیں اور سود کی بنیاد پر قرض دیتے ہیں.....

.....چنانچہ بینک اگرچہ کرنسی تخلیق نہیں کرتے، لیکن وہ نئے قرضے بنا کر چیک بک کی رقم یا کھاتے تخلیق کرتے ہیں، درحقیقت ایک ٹریلین ڈالرز سے اُوپر یہ پرائیویٹ طریقے سے پیدا کردہ رقم کھلی مارکیٹ میں امریکی بانڈز اور تمسکات خریدنے پر خرچ کی گئی، جو بینکوں کو ۵۰ بلین ڈالرز سود دیتے ہیں، جو اس سود کی مقدار سے کم ہے جو کھاتہ داروں کو ادا کرتے ہیں، اس طرح فریکشنل ریزرو کو قرضے دیتے ہوئے ۹۰ فیصد سے کہیں زائد رقم تخلیق کی، اور اسی لئے وہ ۹۰ فیصد سے زائد افراطِ زر کا سبب بنے۔

۱۷۷:- اگرچہ زر کے روایتی مقداری نظریہ (Quantity Theory of Money) نے زَر کی رسد کو کنٹرول کرنے کے بہت سے راستے بتائے ہیں، جن میں سے ایک انٹرسٹ ریٹ کو کنٹرول کرنا بھی ہے، تاہم یہ سب ذرائع یا تدابیر مرض کا علاج نہیں کرسکتے، یہ عارضی اقدامات ہیں، اور یہ اپنے ایسے ذیلی اثرات رکھتے ہیں جو معیشت کو تجارتی چکر میں مبتلا کرتے ہیں، مائیکل روبوتھم نے صحیح تجزیہ کیا ہے:-

> This (Monetary Management) a government does by lowering or raising interest rates. This alternately encourages or discourages borrowing, thereby speeding up or slowing down the creation of money and the growth of the economy ...... The fact that, by this method, people and businesses with outstanding debts,

simply as a management device to deter other borrowers, is an injustice quite lost in the almost religious conviction surrounding this ideology.....

This method of controlling banks, inflation and money supply certainly works; it works in the way that a sledge-hammer works at carving up a roast chicken. An economy dependent upon borrowing to supply money, strapped to a financial system in which both debt and the money supply are logically bound to escalate, is punished for the borrowing it has been forced to undertake. Many past borrowers are rendered bankrupt; homes are repossessed, businesses are ruined and millions are thrown out of work as the economy sinks into recession. Until inflation and overheating are no longer deemed to be a danger, borrowing is discouraged and the economy becomes a stagnating sea of human misery. Of course, no sooner has this been done, than the problem is lack of demand, so we must reduce interest rates and wait for the consumer confidence and the positive investment climate to return. The business cycle begins all over again - There could be no greater admission of the utter and total inadequacy of modern economics to understand and regulate the financial system then through this wholesale entrapment and subsequent bludgeoning of the entire economy. It is a policy which courts illegality, as well as breaching morality, in the cavalier way in which the financial contract of debt is

effectively rewritten at will, via the power of levying infinitely variable interest charges.

ترجمہ:۔ حکومت یہ مالیاتی نظم انٹرسٹ ریٹ کو کم یا زیادہ کرکے چلاتی ہے، یہ انتظام کبھی قرض لینے پر اُبھارتا ہے، کبھی اس کی ہمت شکنی کرتا ہے، جس کے نتیجے میں تخلیقِ زَر اور معیشت کی ترقی کی رفتار یا تیز ہوتی ہے یا سست پڑ جاتی ہے ...... حقیقت یہ ہے کہ اس طریقے پر لوگ اور تجارت بے پناہ قرضوں کی بناء پر اپنے قرضوں پر اچانک اضافی واجبات کا شکار ہوجاتے ہیں، اور بآسانی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دُوسرے قرضداروں کو کنٹرول کرنے کا یہ طریقہ ناانصافی پر مبنی ہے، اگرچہ یہ نظریہ مذہبی عقیدے کی طرح تسلیم کیا جاتا ہے۔

زَر کی رسد، افراطِ زَر اور بینکوں کو کنٹرول کرنے کا یہ طریقہ اس طرح کام کرتا ہے جس طرح دَم پخت (Roast) مرغی پر تیز دھار آرہ کاٹنے کا کام کرتا ہے، ایک معیشت جو سرمایہ کی فراہمی کے لئے قرض لینے پر منحصر ہو اور وہ ایسے مالیاتی نظام سے بندھی ہوئی ہو جس میں قرضے اور سرمایہ کی رسد دونوں منطقی طور پر بڑھنے پر مجبور ہوں، اسے ان قرضوں کی سزا دی جاتی ہے جنہیں وہ اسی نظام کے تحت لینے پر مجبور تھی، بہت سے ماضی کے قرض لینے والے دیوالیہ ہوگئے، ان کے گھروں پر قبضہ کرلیا گیا، تجارت تباہ ہوگئی اور بہت سے لوگ بے روزگار ہوگئے، کیونکہ معیشت تباہی میں ڈوب گئی، جب تک افراطِ زَر اور ضرورت سے زیادہ گرماگرمی کے خطرناک ہونے کا اندیشہ ختم نہ ہوجائے، اس

وقت تک قرضہ لینے کی حوصلہ شکنی ہوتی رہتی ہے، معیشت انسانی بے چارگی کا جامد سمندر بن جاتی ہے، جونہی یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو اب مسئلہ یہ پیدا ہوجاتا ہے کہ طلب کم ہوگئی، لہٰذا شرحِ سود کو پھر کم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ صارفین میں اعتماد پیدا ہو اور مثبت سرمایہ کاری کی فضا لوٹ آئے۔ پوری معیشت کو جس طرح تہ و بالا اس نظام میں کیا جاتا ہے اس سے بڑھ کر اس جدید نظامِ معیشت کی نااہلی کا کوئی اعتراف نہیں ہوسکتا کہ وہ مالیاتی نظام کو کنٹرول کرنے میں کس بُری طرح ناکام ہے۔

۱۷۸:- مزید براں، بینکوں اور تمویلی اداروں کے ذریعے تخلیق کردہ بے بنیاد زر بین الاقوامی بازاروں میں مستقبلیات (Futures) اور اختیارات (Options) کی شکل میں مشتقات (Derivatives) کے ذریعے سٹے بازی کی تجارت میں استعمال کیا جارہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتداء میں مطالبہ زَر کو زَر تسلیم کرلیا گیا، اور اب مطالبے کے مطالبے کو ہی درجہ دیا جارہا ہے، ایک تخمینے مطابق ۱۵۰ ٹریلین سے زائد مالیت کے مشتقات (Derivatives) دُنیا بھر میں چکر کاٹ رہے ہیں، جبکہ دُنیا کے ۱۸۸ ممالک کی مشترک مجموعی ملکی پیداوار (G D P) صرف ۳۰ ٹریلین ڈالر ہے، تقریباً ۸۰ فیصد اس تجارت کا تقریباً دو درجن بینکوں اور فنڈز کے ہیجنگ کے کاروبار (Hedge Funds) میں لگا ہوا ہے۔[1]

دُنیا کی پوری معیشت اس طرح ایک غبارہ کی شکل اختیار کرچکی ہے، جو روز بروز ایسے نئے قرضوں اور تمویلی معاملات سے پھولتا جارہا ہے، جس کا حقیقی معیشت سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ بڑا غبارہ بازار کے جھٹکوں (Shocks) کی زد میں ہے اور کسی

(1) Prof. Khursheed Ahmad, Islamic Finance and Banking: The challenge of the 21st century, the paper-II submitted to the court by the author.

بھی وقت پھٹ سکتا ہے، اور ماضی قریب میں ایسا متعدد مرتبہ ہو چکا ہے، خصوصاً جبکہ ایشین ٹائیگرز مکمل تباہی کے کنارے پہنچے اور ان کے جھٹکے پورے عالم میں محسوس کئے گئے، اور میڈیا نے یہ شور مچایا کہ مارکیٹ کی معیشت اپنے آخری سانس لے رہی ہے۔(۱)

ایک مرتبہ پھر ہم جیمس رابرٹسن کا حوالہ دیں گے جنہوں نے اپنی شاندار کتاب "Transforming Economic Life: A millenial Challenge" میں اس موضوع پر درج ذیل تبصرہ کیا ہے:-

> The money-must-grow imperative is ecologically destructive ..... (It) also results in a massive world-wide diversion of effort away from providing useful goods and services, into making money out of money. At least 95% of the billions of dollars transferred daily around the world are of purely financial transactions, unlinked to transactions in the real economy.
> People are increasingly experiencing the working of the money, banking and finance system as unreal, incomprehensible, unaccountable, irresponsible, exploitative and out of control. Why should they lose their house and their jobs as a result of financial decisions taken in distant parts of the world? Why should the national and international money and finance system involve the systematic transfer of wealth from poor people to rich people, and from poor countries to rich countries? Why someone in Singapore be able

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ٹائمز، ۳؍نومبر ۱۹۹۷ء۔ نیوز ویک ۲۶؍جنوری ۱۹۹۸ء اور ۱۴؍ستمبر ۱۹۸۸ء۔

to gamble on Tokyo Stock Exchange and bring about the collapse of a bank in London? ..... Why do young people trading in derivatives in the city of London get annual bonuses larger the whole annual budgets of primary schools? Do we have to have a money and financial system that works like this? Even the financier George Soros has said ("Capital Crimes", Atlantic Monthly, January, 1997) that "The untrammeled intensification laissez-faire capitalism and the extension of market values into all areas of life is endangering our open and democratic society. The main enemy of the open society, I believe, is no longer the Communist but the Capitalist Threat.

ترجمہ:- ''زر کو لازماً بڑھنا چاہئے'' کا حکم نتیجتاً ہلاکت خیز ہے ..... یہ مفید اشیاء اور خدمات فراہم کرنے کی کوششوں کا رُخ عالمی پیمانے پر زر کے ذریعے زر کی تخلیق کی کوششوں کی طرف موڑ دیتا ہے، تقریباً کئی بلین ڈالرز کا روزانہ تبادلہ صرف تمویلی معاملات کی وجہ سے ہوتا ہے، جس کا تعلق حقیقی معیشت سے بالکل نہیں ہوتا۔

لوگ، زر، بینکاری اور تمویلی نظام کے غیر حقیقی، غیر جامع، احتساب سے بری، غیر ذمہ دارانہ، استحصال والے، بے قابو اور روزانہ بڑھتے ہوئے اعمال کا مسلسل مشاہدہ کر رہے ہیں، دُنیا کے دُور دراز علاقوں میں مالیاتی فیصلوں کے نتیجے میں انہیں اپنے مکانات اور ملازمتوں سے کیوں محروم ہونا پڑتا ہے؟ کیوں علاقائی اور بین الاقوامی زر اور مغربی ممالک کے مال داروں کی

طرف خودکار طریقے سے غریب سے مال دار کی طرف منتقلی میں
کیوں ملوّث ہوتا ہے؟ سنگاپور میں کچھ لوگ ٹوکیو اسٹاک ایکسچینج
میں سٹہ بازی کھیلنے کے کس طرح قابل ہوتے ہیں، جو کہ لندن
کے بینکوں کے زوال کا سبب بن جاتا ہے؟ لندن شہر میں
مشتقات (Derivative) کے اندر تجارت کرنے والے لوگ
پرائمری اسکول کے سالانہ بجٹ سے زیادہ نفع کیسے کماتے ہیں؟
کیا ہمیں اپنے زَر اور مالیاتی نظام کو اسی طرح برقرار رکھنا ہوگا؟
سرمایہ دارانہ نظام میں حکومت کی عدمِ مداخلت (Laissez-fair)
کا آزاد پھیلاؤ اور زندگی کے ہر شعبے میں مارکیٹ ویلیو کی
آزادی نے ہمارے ظاہری اور جمہوری معاشرے کو خطرے میں
ڈال دیا ہے، مجھے اشتراکیت کے مقابلے میں سرمایہ داریت
سے زیادہ خطرہ ہے۔

۱۷۹:- آج پوری دُنیا کی یہ خطرناک صورتِ حال دراصل سود پر مبنی نظام کو معیشت پر بے قابو اختیار دیے جانے کا نتیجہ ہے، کیا کوئی شخص پھر بھی یہ اصرار کرسکتا ہے کہ تجارتی سود ایک معصومانہ معاملہ ہے؟ درحقیقت تجارتی سود کے بحیثیت مجموعی نقصانات ان صَرفی سود کے معاملات سے کہیں زیادہ ہیں جس سے چند افراد انفرادی طور پر متأثر ہوتے تھے۔

انٹرسٹ اور انڈیکسیشن

۱۸۰:- بعض اپیل کنندگان نے بینکوں کے سود کو جائز قرار دینے کی یہ توجیہ پیش کی کہ چونکہ روپے کی مالیت روز بروز مستقل گھٹتی چلی جارہی ہے، تو انٹرسٹ کو روپے کی مالیت کے نقصان کی تلافی قرار دینا چاہئے، تمویل کرنے والے (Financier)

کوکم از کم اتنی مقدار کے مطالبے کا حق ملنا چاہئے جتنی مالیت کا اُس نے دُوسرے کو قرضہ دیا تھا، لیکن اگر وہ عددی طور پر اتنی ہی تعداد واپس لے گا، تو وہ اب اتنی ہی قوتِ خرید واپس نہیں لے گا، جتنی کہ بوقتِ قرضہ اس نے دی تھی، کیونکہ افراطِ زر روپے کی بہت بڑی مالیت حقیقت میں کم کرچکی ہوگی، اسی لئے ان کی دلیل یہ تھی کہ انٹرسٹ کے ذریعے تمویل کرنے والے کو ہونے والے نقصان کی تلافی کردینی چاہئے۔

۱۸۱:- یہ دلیل بالکل بے وزن ہے، کیونکہ شرحِ سود (ریٹ آف انٹرسٹ) اگرچہ افراطِ زر کا دُوسرے اسباب کے ساتھ ایک سبب ہے، لیکن یہ شرحِ سود (ریٹ آف انٹرسٹ) افراطِ زر کی شرح پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ اگر سودی شرح افراطِ زر کا معاوضہ ہوتی تو افراطِ زر کی شرح ہمیشہ سودی شرح کے ہم وزن ہوتی، بلکہ سودی شرح کا تعین زر کی رسد و طلب کی طاقتیں کرتی ہیں، افراطِ زر کی قیمت اس کا تعین نہیں کرتی۔ اگر کسی بھی وقت دونوں قیمتیں ایک دُوسرے کے ہم وزن ہوجائیں تو وہ اتفاقی حادثہ تو ہوسکتا ہے، کسی متعین اُصول کا اثر نہیں ہوتا، اسی وجہ سے سود کو قوتِ خرید کے نقصان کا معاوضہ اور بدل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۱۸۲:- کچھ دُوسرے طبقے افراطِ زر کو دُوسرے رُخ سے دیکھتے ہیں، ان کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ مروّجہ سود افراطِ زر کے نقصان کی تلافی کے لئے ہے، تاہم ان کا مشورہ یہ ہے کہ قرضوں کا انڈیکسیشن موجودہ سودی قرضوں کا مناسب متبادل بن سکتا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ تمویل کرنے والے شخص (قرض خواہ) کو اس کے تمویل کرنے کی صورت میں اس کی قوتِ خرید کو پیش آنے والے نقصان کی تلافی کردینی چاہئے، لہٰذا اسے ایک ایسی مقدار کے مطالبے کا حق حاصل ہے، جو اس کے افراطِ زر کی قیمت کے برابر ہو، اسی وجہ سے ان کے نزدیک انڈیکسیشن کو بینکاری نظام میں سود کے ایک متبادل کے طور پر متعارف کیا جانا چاہئے۔

۱۸۳:- لیکن اس بحث میں پڑے بغیر کہ آیا قرضوں کا انڈیکسیشن شریعت

کے مطابق ہے یا نہیں؟ جہاں تک بینکاری معاملات کا تعلق ہے تو یہ مشورہ نا قابل عمل ہے، اس کی وجہ واضح ہے، قرضوں کی انڈیکسیشن کا تصور یہ ہے کہ تمویل کرنے والے یا قرض خواہ کو اس کے سرمایہ کی حقیقی مالیت افراطِ زر کی قیمت پر مبنی عوض کی صورت میں لوٹائی جائے، لہٰذا اس لحاظ سے کھاتہ داروں اور قرضہ لینے والوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ بینک اپنے مقروضوں سے وہی قیمت وصول کرے گا، جو اس کو اپنے کھاتہ داروں کو ادا کرنی ہوگی، کیونکہ وہ دونوں قیمتیں افراطِ زر پر مبنی ہوں گی، اس طرح بینکوں کے واسطے کچھ باقی نہیں بچے گا اور بینک بغیر نفع کے چلائے جائیں گے۔ محترم خالد ایم اسحاق صاحب جو انڈیکسیشن کی طرف مائل نظر آرہے تھے، جب اُن سے بینچ نے یہ سوال کیا کہ بینکاری نظام تنہا انڈیکسیشن کی بنیاد پر کیسے قائم کیا جائے گا؟ تو انہوں نے اس بات کا برملا اعتراف کیا کہ اس کا ان کے پاس کوئی تیار جواب نہیں ہے، تاہم اس تجویز پر گہرائی سے غور کرنا ہوگا۔ بعض بینکار حضرات جو کورٹ کی معاونت کے لئے تشریف لائے تھے، خصوصاً محترم جناب عبدالجبار خان صاحب جو نیشنل بینک آف پاکستان کے سابق صدر بھی ہیں، انہوں نے اپنی قطعی رائے یہ دی کہ انڈیکسیشن کو سود کا متبادل قرار دینا بینکاری کے نقطۂ نگاہ سے صحیح نہیں ہے۔

۱۸۴:- مندرجہ بالا بحث سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ موجودہ شرحِ سود کو افراطِ زر کی بنیاد پر قابلِ قبول نہیں کہا جا سکتا، اور نہ ہی انڈیکسیشن کو موجودہ بینکاری نظام کے سود کے متبادل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۸۵:- تاہم قدرِ زر کی کمی کا سوال انفرادی اور غیر ادا شدہ قرضوں کے لئے یقیناً قابلِ غور ہے، کیونکہ بہت سے ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ جب قرض دینے والے قرض دینے کے بعد بہت مشکلات کا سامنا کرتے ہیں، خصوصاً جبکہ کسی کرنسی کی مالیت نا قابلِ تصور حد تک گر جائے، جیسے کہ ترکی، شام، لبنان اور سابقہ رُوس کی متحدہ ریاستوں میں ہوا۔ ہمارے ملک میں بھی آج روپے کی مالیت ۱۹۷۰ء کے مقابلے میں

بہت کم ہے، اب سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے ۱۹۷۰ء سے قبل کسی کو ایک ہزار روپے قرض دیئے تھے اور مقروض شخص نے اس کو اس کا سرمایہ آج تک واپس نہیں کیا تو کیا وہ شخص اب بھی صرف ایک ہزار روپے ہی واپس لے گا، جبکہ یہ رقم درحقیقت اب (اُس زمانے کے) سو روپے سے زائد مالیت نہیں رکھتی؟ یہ سوال اس وقت اور بھی شدید ہو جاتا ہے جبکہ مدیون ادائیگی کے قابل ہونے کے باوجود قرض ادا نہ کرے۔

۱۸۶:- اسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے مختلف طبقات کی طرف سے بہت سی تجاویز پیش کی جاتی ہیں، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:-

الف:- قرضوں کو انڈیکس کرنا چاہئے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مدیون کو افراطِ زر کی شرح کے حساب سے قرض کی ادائیگی کے وقت ایک اضافی رقم بھی ادا کرنی چاہئے۔

ب:- قرضوں کو سونے کے ساتھ منسلک کر دینا چاہئے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کسی شخص نے ایک ہزار روپے قرض دیئے تو اس نے گویا اتنی مقدار سونے کی قرض دے دی جتنی اس وقت ایک ہزار سے خریدی جا سکتی تھی، اور بوقتِ ادائیگی اتنے روپے اس کو ادا کرنے چاہئیں جتنے کہ اتنی مقدار میں سونا خریدنے کے لئے درکار ہوں۔

ج:- قرضوں کو کسی مستحکم کرنسی مثلاً ڈالرز کے ساتھ منسلک کر دینا چاہئے۔

د:- قدرِ زر کم ہونے کا نقصان قرض خواہ اور مقروض دونوں کو برابر تناسب کے ساتھ برداشت کرنا چاہئے، بالفرض اگر قدرِ زر ۵ فیصد کم ہوئی ہے، تو ڈھائی فیصد مقروض کو ادا کرنا چاہئے، اور بقیہ ڈھائی فیصد قرض خواہ کو برداشت کرنا چاہئے، کیونکہ افراطِ زر ایک ایسی چیز ہے جو ان دونوں میں سے ہر ایک کے اختیار سے باہر ہے، مشترکہ ابتلاء کی وجہ سے اسے دونوں کو مشترکہ طور پر برداشت کرنا چاہئے۔

۱۸۷:- لیکن ہمارا یہ خیال ہے کہ اس سوال پر مزید گہرائی کے ساتھ غور کیا

جانا چاہئے، اور عدالت کے کسی حتمی فیصلے سے قبل اس مسئلے کو ملک کے مختلف تحقیق حلقوں مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل یا اسلامی اقتصادی کمیشن وغیرہ میں اُٹھایا جانا چاہئے، بہت سے بین الاقوامی سیمینار اس مسئلے پر غور وخوض کرنے کے لئے منعقد کئے جا چکے ہیں، ان سیمیناروں کے مقالوں اور قراردادوں کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کرنا چاہئے۔

۱۸۸:۔ اس کے برعکس جیسا کہ ہم یہ بات طے کر چکے ہیں کہ یہ سوال نہ تو سود کو حلال کرنے کا ایک ثبوت فراہم کرتا ہے، اور نہ ہی یہ موجودہ بینکاری معاملات کا ایک صحیح متبادل فراہم کرتا ہے، لہٰذا ہمیں اس مسئلے کو اسی مقدمے میں حل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور نہ ہی چیلنج کردہ قوانین کے بارے میں فیصلہ اس پر مبنی ہے، لہٰذا ہم اس سوال کو مزید تحقیق اور ریسرچ کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔

مارک اَپ اور سود

۱۸۹:۔ بعض اپیل کنندگان کا یہ موقف تھا کہ اگرچہ سود قرآن اور حدیث کی رُو سے حرام قرار دیا گیا ہے، تاہم موجودہ بینک سودی معاملات سرانجام نہیں دیتے، اس کے بجائے وہ اپنے صارفین سے مارک اَپ وصول کرتے ہیں، محترم حافظ ایس اے رحمٰن صاحب نے، جو ایگریکلچرل ڈیولپمنٹ بینک کے وکیل کی حیثیت سے پیش ہوئے تھے، ایک تفصیلی بیان دیا جس میں انہوں نے غیر سودی بینکاری سے متعلق حکومتی اقدامات کی ایک تاریخ بیان فرمائی، ان کے بقول ۱/۴/۱۹۹۸ء سے تمام صارفین بشمول انفرادی صارفین کی تمویل غیر سودی طریقے کے مطابق تبدیل کر دی گئی ہے، ۱/۷/۱۹۹۵ء سے تمام سودی کھاتے ختم کر کے انہیں نفع نقصان میں شراکت کے طرز پر بنا دیا گیا ہے، البتہ کرنٹ اکاؤنٹ اس سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ وہ کسی قسم کا نفع نہیں دیتے، اسی ہدایت کو مؤثر بنانے کے لئے اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے تقریباً ایسے ۱۲ تمویلی طریقوں کی اجازت دی جو غیر سودی بھی تھے اور تمام بینکوں اور مالیاتی اداروں

میں قابلِ استعمال بھی تھے، حکومت نے بھی قوانین کو غیر سودی بنانے کے لئے متعدد ترامیم کی ہیں، ان تمام اقدامات کے بعد اب سود، بینکاری معاملات میں برقرار نہیں رہا، اب تمام بینک اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے مقرر کردہ ۱۲ اسلامی طریقہ ہائے تمویل کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے مزید دلائل دیتے ہوئے کہ چونکہ سود پہلے ہی ختم کیا جاچکا ہے، لہٰذا اب سود کو ختم کرنے کی درخواست دینے کی کوئی ضرورت برقرار نہیں ہے۔

۱۹۰:- حافظ ایس اے رحمٰن صاحب کی یہ بیان کردہ تاریخ صحیح ہے کہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے سود کے بجائے ۱۲ اسلامی طریقہ ہائے تمویل تجویز کئے ہیں، البتہ علمی طور پر ان بارہ طریقہ ہائے تمویل میں سے صرف دو یا تین طریقے عموماً استعمال کئے جارہے ہیں، عملی طور پر صرف یہ ہو رہا ہے کہ سود کا نام مارک اَپ سے تبدیل کردیا گیا ہے، مارک اَپ کا تصور اصل میں اسلامی نظریاتی کونسل نے ربا کے خاتمہ کی بابت اپنی ۱۹۸۰ء کی رپورٹ میں پیش کیا تھا، کونسل نے یہ تجویز دی تھی کہ درحقیقت سودی تمویل کا صحیح اسلامی متبادل مشارکہ اور مضاربہ ہیں، تاہم کچھ مواقع ایسے بھی ہیں جہاں پر مشارکہ اور مضاربہ کے ذریعے تمویل ممکن نہیں ہے، ان مواقع کے لئے کونسل نے ایک تکنیک استعمال کرنے کی اجازت دی جس کو اسلامی بینک عموماً مرابحہ سے تعبیر کرتے ہیں، اس تکنیک کے مطابق تمویل کرنے والا بینک سود پر قرض دینے کے بجائے صارف کو مطلوب مشینری خرید کر اُسی صارف کو اُدھار پر ایک نفع یا مارک اَپ کے ساتھ فروخت کردیتا ہے، درحقیقت یہ کوئی تمویلی طریقہ نہیں ہے، بلکہ یہ صارف کے حق میں ایک خرید و فروخت کا معاملہ ہے جس میں مندرجہ ذیل نکات کا لحاظ انتہائی ضروری ہے:-

الف:- اس قسم کا عقد صرف اس صورت میں انجام دیا جاسکتا ہے جبکہ کسی بینک کا صارف کسی چیز کو خریدنا چاہتا ہو، اس قسم کا معاملہ اس وقت سرانجام نہیں دیا

جاسکتا جبکہ صارف کسی چیز کی خریداری کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے تمویل چاہتا ہو، مثال کے طور پر تنخواہوں کی ادائیگی، بلوں اور واجبات کے تصفیے وغیرہ کے لئے تمویل درکار ہو۔

ب:۔ اس کو حقیقی معاملہ بنانے کے واسطے یہ ضروری تھا کہ وہ چیز بینک حقیقت میں خریدے، اور وہ بینک کے (حقیقی یا حکمی) قبضے میں آجائے، تاکہ وہ اس چیز کا ضمان یا رِسک اس وقت تک برداشت کرے جب تک وہ اس کے قبضے اور ملکیت میں برقرار رہے۔

ج:- بینک کے قبضے اور ملکیت میں آجانے کے بعد اُسے ایک عقدِ صحیح کے ذریعے صارف (Client) کو فروخت کردیا جائے۔

د:۔ کونسل نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ یہ طریقۂ تمویل کم سے کم حد تک صرف اس جگہ استعمال کیا جانا چاہئے کہ جہاں پر مشارکہ اور مضاربہ متعدّد وجوہ سے استعمال کرنا ممکن نہ ہو۔

۱۹۱:- بدقسمتی سے اس تکنیک کو بینکوں اور تمویلی اداروں میں لاگو کرتے وقت اُوپر کے تمام نکات مکمل طور پر بھلا دیئے گئے، صرف یہ کیا گیا کہ سود کا نام ''مارک اَپ'' رکھ دیا گیا، موجودہ مارک اَپ سسٹم میں کسی قسم کی شے کی خرید وفروخت کا کوئی معاملہ نہیں ہوتا، اگر بالفرض کوئی خریداری ہو بھی تو اس شے کو بینک نہ خریدتا ہے اور نہ اُسے آگے صارف کو بیچتا ہے، بعض اوقات یہ تکنیک صرف بائی بیک/ Buy Back (بیع العینہ) کے لئے ہوتی ہے، جس میں صارف اس چیز کو پہلے ہی اپنے لئے خرید چکا ہوتا ہے، اور اسے بینک کو سستے داموں بیچ کر مہنگے داموں واپس خریدنے کا عقد کرلیا جاتا ہے، جس کا اصل عقد کو کھیل بنانے کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہے، بعض اوقات یہ عقد صرف اصل اشیاء کو خریدے یا بیچے بغیر صرف کاغذات پر ہی کرلیا جاتا ہے، مزید براں یہ تکنیک بلاتمیز اختیار کی جاتی ہے اور بینکاری کے تمام معاملات پر

مرابحہ کا عقد کیا جاتا ہے، خواہ وہاں درحقیقت اشیاء کی خریداری مقصود ہو یا نہ ہو، اور یہ طریقہ کار ہر قسم کی تمویل کے لئے اپنایا جاتا ہے، خواہ بالائی اخراجات مثلاً تنخواہوں اور بلوں کی ادائیگی وغیرہ کے لئے ہو، لہٰذا اس کا خالص نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اب تک بینکوں کے اثاثوں کی جانب میں کوئی بامقصد تغیر سامنے نہیں آیا ہے، لہٰذا وہی سود کے اُوپر لاگو اعتراضات موجودہ مارک اَپ سسٹم پر بھی بجا طور سے عائد ہوتے ہیں، اور اس نظام کو بھی قرآن وسنت کے موافق نظام نہیں کہا جاسکتا، اور ہم بھی یہی قرار دیتے ہیں۔

قرض اور قراض

۱۹۲:۔ ڈاکٹر ایم اسلم خاکوانی جو شریعت اپیل نمبر۱ (ایس) ۱۹۹۲ء کے اپیل کنندہ تھے، وہ اگرچہ وفاقی شرعی عدالت میں ان مقدمات کی کارروائیوں میں فریق نہیں تھے، تاہم اس معاملے کی عمومیت اور اہمیت کے پیشِ نظر ہم نے انہیں تفصیل سے سنا، اپنی اپیل کی تحریری یادداشت میں انہوں نے تقریباً وہی سارے دلائل دیئے جس پر ہم پیچھے بحث کر چکے ہیں، تاہم اپنے زبانی بیان میں انہوں نے بالکل مختلف خطوط پر دلائل دیئے، انہوں نے اپنی رائے یہ بیان کی کہ اگر تمویل کنندہ (Financier) ایک متعین نفع کی وصولی کی شرط پر تمویل کرے خواہ مدیون (Creditor) کو نفع ہو یا نقصان ہو، تو اس صورت میں یہ رِبا بن جائے گا، لیکن اگر عقدِ تمویل میں یہ شرط ہو کہ نقصان کی صورت میں نقصان دونوں فریق اپنی سرمایہ کاری کے تناسب سے برداشت کریں گے، تو عقد کو صحیح کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے، اگرچہ فریقین اس بات پر بھی راضی ہو چکے ہوں کہ اگر تجارت میں نفع ہوا تو اس کی ایک شرح نفع اصل سرمایہ کاری کے تناسب سے تمویل کرنے والے کو ملے گی، لہٰذا اب یہ قراض کا عقد بن جائے گا جو شریعت میں ناجائز نہیں ہے۔

۱۹۳:۔ سب سے پہلے تو یہ نقطۂ نظر ان قوانین پر مدعیان کی جانب سے دائر

کردہ اعتراضات کا دفاع نہیں کرتا، جو موضوعِ گفتگو اور موضوعِ بحث ہیں، کیونکہ یہ قوانین ہر حالت میں ایک متعین نفع تمویل کرنے والے کے لئے مقرّر کردیتے ہیں، لہٰذا ان کی ان قوانین کو غیر اسلامی قرار دیئے جانے کے خلاف اپیل بے اثر ہوجاتی ہے، تاہم ان کا نقطۂ نظر سود کے متبادل تلاش کرنے میں معاون ہوسکتا تھا، لیکن ان کے نقطۂ نظر کی قرآن و سنت سے تائید نہیں ہوتی۔ قراض کی اصطلاح اسلامی فقہ میں مضاربہ کے مرادف کے طور پر استعمال کی گئی ہے، اور تمام مذاہبِ فقہ اس بارے میں متفق ہیں کہ سرمایہ کار (رَبّ المال) کے واسطے مضاربہ میں کوئی بھی نفع اس کی سرمایہ کاری کے تناسب سے مقرّر نہیں کیا جاسکتا، اس طرح کی کوئی شرط ناجائز سمجھی جائے گی۔ محترم اپیل کنندہ کے نقطۂ نظر میں ازخود تضاد نظر آتا ہے، کیونکہ انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ نقصان کی صورت میں سرمایہ کار کسی بھی نفع کا مستحق نہیں ہوگا، لیکن دُوسری طرف اگر سرمایہ کار نے اپنے حصۂ نفع کے طور پر اپنی سرمایہ کاری کا ۱۰ فیصد مقرّر کیا، یہ اپیل کنندہ کے لئے قابلِ قبول ہوگا، لیکن اس وقت کیا ہوگا جبکہ کل نفع سرمایہ کاری کے دس فیصد سے زائد حاصل نہ ہو؟ اس صورت میں ان کے نزدیک سارا نفع سرمایہ کار لے جائے گا اور مضارب کو تجارت میں نفع ہونے کے باوجود کچھ حاصل نہ ہوگا، لہٰذا یہ نقطۂ نظر اس وجہ سے ناقابلِ قبول ہے۔

رِبا اور نظریۂ ضرورت (Riba & Doctrine of Necessity)

۱۹۴:- آخر میں بعض اپیل کنندگان نے رِبا کے مقدمے میں نظریۂ ضرورت چسپاں کرنے کی کوشش کی، ہاؤس بلڈنگ فائنانس کارپوریشن (HBFC) کے مینجنگ ڈائریکٹر محترم صدیق الفاروق صاحب نے یہ دلیل دی کہ قرآنِ پاک نے انسان کو اپنی سخت بھوک کی حالت میں زندگی بچانے کے لئے خنزیر کھانے کی بھی اجازت دی ہے۔ بعض اپیل کنندگان کا یہ موقف تھا کہ سود پر مبنی نظام ایک ایسی عالمگیر ضرورت بن

چکا ہے کہ کوئی ملک بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، سود کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اسے قرآنِ پاک نے حرام قرار دیا ہے، تاہم ملکی سطح پر اس کی حرمت کا نفاذ ایسی خودکشی کے مترادف ہوگا جو تمام ملکی معیشت کو نقصان پہنچادے گا، اس لئے اس کو اسلامی اَحکامات کے خلاف نہیں قرار دینا چاہئے۔ بعض اپیل کنندگان نے یہ دلیل بھی دی کہ آج پوری دُنیا ایک عالمی بستی کی شکل اختیار کرچکی ہے، اور کوئی ملک تنہا نہیں رہ سکتا، بالخصوص ہمارا ملک جو کہ قرضوں تلے دبا ہوا ہے، اور اس کے تمام ترقیاتی منصوبے زیادہ تر غیرملکی سودی قرضوں پر منحصر ہیں، ایک مرتبہ اگر مکمل طور پر سود کی حرمت نافذ کردی جائے تو یہ تمام ترقیاتی منصوبے آخری سانس لیں گے اور پوری معیشت اچانک زوال کا شکار ہوجائے گی۔

۱۹۵:- ہم اس دلیل پر کافی توجہ دے چکے ہیں، اور ہم نے اس پہلو پر متعدّد معاشی ماہرین، بینکاروں اور پیشہ ور حضرات کی معاونت میں سنجیدگی کے ساتھ غور بھی کیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ایک حقیقت پسند مذہب ہے، وہ کبھی کسی ایسے حکم پر کسی بھی فرد یا حکومت کو مجبور نہیں کرتا کہ جس کی تعمیل اس کے اختیار سے باہر ہو۔ نظریۂ ضرورت ان نظریات میں سے ایک ہے جو قرآنِ کریم اور سنت سے مستنبط اور ماخوذ ہیں اور جسے مسلمان فقہائے کرامؒ نے تفصیلاً بیان بھی کیا ہے، یہ بات محترم صدیق الفاروق صاحب نے بجا ارشاد فرمائی کہ قرآنِ کریم نے اتنی شدید بھوک کے عالم میں خنزیر کھانے کی بھی اجازت دی ہے کہ اس کے بغیر جینا مشکل ہوجائے، لیکن اسلام میں نظریۂ ضرورت کا تصوّر مجمل اور مبہم نہیں ہے، مسلمان فقہائے کرامؒ نے قرآن وسنت سے استنباط کرکے اس کے کچھ ایسے اوصاف بیان فرمائے ہیں جن سے ضرورت کی شدّت اور مقدار کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے مواقع پر کس حد تک قرآن وسنت کے اَحکام کے مطابق گنجائش دی جاسکتی ہے، اسی لئے ضرورت کی بنیاد پر کسی بھی مسئلے پر کوئی فیصلہ کرنے سے قبل اس بات کی یقین دہانی

ضروری ہوگی کہ ضرورت حقیقی ہے اور خیالی اندیشوں اور ملمع سازی پر مبنی نہیں ہے، اور مزید یہ کہ اس ضرورت کی تکمیل اس ناجائز کام کے سرانجام دیئے بغیر ناممکن ہے۔ جب ہم مذکورہ بالا اُصولوں کی روشنی میں سود کے بارے میں غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اس بارے میں بہت زیادہ مبالغے سے کام لیا جارہا ہے کہ اگر سود کا بالکلیہ خاتمہ کردیا گیا تو یہ معیشت کے خاتمے کا سبب بنے گا، حقیقت پسندانہ تجزیے کے لئے ہمیں اندرونی اور بیرونی معاملات پر علیحدہ علیحدہ غور کرنا ہوگا۔

اندرونی معاملات

۱۹۶:- اندرونی معاملات میں سود کے خاتمے کے خلاف خدشات اس پر مبنی ہیں کہ زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ سود کے خاتمے کا مقصد بینکوں کو خیراتی اداروں میں تبدیل کردینا ہے، اور بینک اسلامی نظام کے تحت رقمیں کسی نفع کے بغیر تمویل کیا کریں گے، لہٰذا کھاتہ داروں کو بھی بینکوں میں رکھی گئی رقوم کے عوض کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہم نے قدرے تفصیل کے ساتھ پیچھے اسلام میں قرض کے تصور پر بحث کی ہے، اور یہ ذکر کیا ہے کہ اسلام میں قرض کا کردار تجارتی معیشت میں بہت محدود ہے، بینکوں اور تمویلی اداروں کو اسلامائز کرنے کا مطلب بغیر نفع کے تمویل کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بینک نفع نقصان میں شراکت کی بنیاد اور دُوسرے اسلامی طریقہ ہائے تمویل کی بنیاد پر تمویل کریں گے، جن میں سے کوئی بھی نفع کے بغیر نہیں ہوگا۔

۱۹۷:- کچھ دُوسرے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اسلامی اُصولوں پر مبنی متبادل بینکاری نظام ابھی تک نہ تو تیار کیا گیا ہے اور نہ ہی اس پر عمل کیا گیا ہے، لہٰذا اس کی اچانک تعمیل کرنے سے ہم ایک ایسے تاریک اور مبہم علاقے میں داخل ہوجائیں گے کہ جو ہمیں اَن دیکھے خطرات کی طرف دھکیل دے گا، جو ہماری معیشت پر مکمل تباہی لاسکتا ہے۔

۱۹۸:- یہ خدشہ درحقیقت موجودہ بینکاری نظام کے بارے میں نئے افکار اور اسلامی بینکاری نظام کے میدان میں گزشتہ تین دہائیوں میں کی گئی مساعی سے بے خبری اور ناآگاہی پر مبنی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی بینکنگ کوئی دیومالائی یا افسانوی خواب نہیں ہے، مسلمان فقہائے کرام اور معاشی ماہرین اسلامی بینکاری کے مختلف میدانوں میں تقریباً پچاس سال سے کام کر رہے ہیں، اور ۱۹۷۰ء سے اسلامی بینکاری کا تصور ایسے حقیقی اداروں کے رُوپ میں تبدیل ہوا جو اسلامی خطوط کے مطابق کام کر رہے ہیں، پوری دُنیا میں اسلامی بینکوں اور تمویلی اداروں کی تعداد تین دہائیوں سے روز بروز بڑھ رہی ہے، ہانگ کانگ شنگھائی بینک لندن کے اسلامی بینکنگ کے شعبے کے انچارج محترم اقبال احمد خان نے، جو اس کورٹ میں عدالتی مشیر کی حیثیت سے تشریف لائے تھے، یہ بیان کیا کہ اسلامی بینکوں اور تمویلی اداروں کی تعداد ۶۵ ممالک میں نوّے بلین ڈالرز کے سرمایہ اور ۱۵ فیصد سالانہ اضافے کے ساتھ دوسو سے زائد ہے، ۲۰۰۰ء سے قبل ایک اندازے کے مطابق یہ سرمایہ سو (۱۰۰) بلین ڈالرز تک پہنچ جائے گا۔

۱۹۹- موجودہ اسلامی ترقیاتی بینک (IDB) جدہ کو آرگنائزیشن آف اسلامی کانفرنس (O.I.C) نے ۱۹۷۵ء میں اسلامی بینکاری کے موجد کے طور پر قائم کیا تھا، اس بینک کا اوّلین مقصد رُکن ممالک کے ترقیاتی منصوبوں کے واسطے بین الحکومتی تمویلی عقود کے ذریعے سرمایہ فراہم کرنا تھا، لیکن یہ اب پرائیویٹ سیکٹر (نجی شعبے) میں بھی تجارتی تمویل (ٹریڈ فائنانس) کی سہولت فراہم کر رہا ہے، یہ بینک اب اپنا ایک تحقیقی مرکز قائم کئے ہوئے ہے جو اسلامی بینکاری اور معیشت کے مختلف مسائل پر کام کر رہا ہے، عدالتِ ہٰذا نے اس بینک کو عدالت کی معاونت کرنے، اور موجودہ اسلامی بینکوں کے طریقِ کار پر روشنی ڈالنے اور موجودہ بینکاری نظام کو اسلامی خطوط اور تمویل کے مطابق ڈھالنے کے واسطے پیش کردہ تجاویز کے امکان کا جائزہ لینے کے لئے اپنے

بینک کے ماہرین بھیجنے کی دعوت دی، اس بینک نے اس سلسلے میں ازراہ مہربانی ایک اعلیٰ اختیاراتی وفد اسلامی ترقیاتی بینک کے صدر جناب ڈاکٹر احمد محمد علی کی سربراہی میں ازخود بھیجا، مختلف ارکانِ وفد بشمول صدرِ بینک نے کورٹ سے خطاب کیا اور اپنی تحریری رپورٹ بھی داخل کی، تفصیلات کے علاوہ ان کے اپنے معروضات کا خلاصہ خود ان کے الفاظ میں درج ذیل ہے:-

The experience accumulated by Islamic banks, in general, and the Islamic Development Bank in particular, as well as attempts made in a number of Muslim countries to apply an Islamic financial system, indicate that the application of such an Islamic system by any Muslim country, at the national level, is feasible. According to the data compiled by the International Union of Islamic Banks, there are 176 Islamic banks and institutions in the world. In terms of number, 47% of these institutions are concentrated in South and South East Asia, 27% in GCC and Middle East, 20% in Africa and 6% in the Western countries. In terms of deposits, amounting to US$ 122.6 billion and total assets amounting to US$ 147.7 billion. 73% of the activities of these institutions are concentrated in the GCC and the Middle East. IDB alone, since its inception form 1976 to 1999, has provided financing in the range of US$ 21.0 billion. As against a growth rate of 7% per annum recorded by the global financial services industry, Islamic banking is growing at a rate of 10-15% pre annum and accounts for

50-60% of the share of the market in the GCC and Middle East.

Islamic banking is distinctive in two respects: concentrating on the real sector of the economy, it imparts tremendous stability to the economic system by achieving an identity between monetary flows and goods and services, and by operating on a system of profit and loss sharing in its evolved state, it insulates the society from the debt-mountain on the analogy that if the economies enter into recessionary or deflationary phases, the principles of profit and loss sharing protects the states and economic operators from the evils of accumulation of interest and minimizes defaults and bankruptcies.

ترجمہ:- اسلامی بینکوں کو بالعموم اور اسلامی ترقیاتی بینک کو بالخصوص جو تجربہ ہوا اور اسلامی تمویلی نظام کے سلسلے میں کئی مسلمان ممالک میں جو کوششیں کی گئیں یہ سب چیزیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ کسی اسلامی ملک میں ایسا اسلامی نظام کا قیام ممکن العمل ہے، اسلامی بینکوں کے اتحاد کی بین الاقوامی تنظیم (انٹرنیشنل یونین آف اسلامک بینکس) کے مطابق دُنیا میں اس وقت ۱۷۶ اسلامی بینک اور تمویلی ادارے موجود ہیں، تعداد کے لحاظ سے ان میں سے ۴۷فیصد جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا میں واقع ہیں، ۲۷فیصد دولتِ مشترکہ اور مشرقِ وسطیٰ میں، ۲۰فیصد افریقہ میں اور ۶فیصد مغربی ممالک میں واقع ہیں، کھاتوں کے لحاظ سے ان کی مالیت ۱۱۲٫۶ بلین امریکی ڈالرز، اور اثاثوں کے لحاظ سے

مالیت ۱۴۷،۷ بلین امریکی ڈالرز ہے، ان کی ۷۳ فیصد سرگرمیاں دولتِ مشترکہ اور مشرقِ وسطیٰ میں ہیں، خود اسلامی ترقیاتی بینک نے اپنی ابتداء ۱۹۷۶ء سے لے کر ۱۹۹۹ء کے عرصے میں ۲۱،۰ بلین امریکی ڈالرز کی حد تک تمویل کی ہے، عالمی تمویلی خدمات کی صنعت میں اضافے کی شرح سالانہ سات فیصد ہے، اس کے برخلاف اسلامی بینکاری کی شرحِ اضافہ ۱۰ سے ۱۵ فیصد سالانہ اور دولتِ مشترکہ اور مشرقِ وسطیٰ کی مارکیٹ میں ۵۰ سے ۶۰ فیصد تک شمار کی گئی ہے۔

اسلامی بینکاری دو لحاظ سے بڑی قابلِ امتیاز ہے، ایک یہ کہ وہ معیشت کے حقیقی شعبے میں مرتکز ہے، مالیاتی بہاؤ اور اشیاء و خدمات کے درمیان ایک شناخت پیدا کرکے، نفع و نقصان میں شرکت کے اعلیٰ نظام کو اپناتے ہوئے یہ معاشی نظام میں زبردست استحکام پیدا کرتی ہے، یہ معاشرے کو قرضوں کے بوجھ سے بچاتی ہے، اس وجہ سے کہ اگر کبھی معیشت بحران کا شکار ہوجائے تو نفع نقصان میں شراکت کے اُصول ریاست اور معاشی کارکنان کو اجتماعِ سود (Accumulation of Interes) کی خرابیوں سے محفوظ رکھتے ہیں، اور دیوالیہ پن اور نادہندگیوں (Defaults) کے خطرات کم کرتے ہیں۔

۲۰۰:- چونکہ اسلامی بینکاری کا تجربہ ابھی ابتدائی مرحلے سے گزر رہا ہے، اس لئے اس صنعت کو متعدد مسائل کا سامنا ہے، یہ مسائل بہت سے تحقیقی اداروں، تعلیمی حلقوں، تربیتی پروگراموں، ورک شاپوں اور کانفرنسوں میں سامنے لائے گئے ہیں، آج بہت بڑی تعداد میں کانفرنسیں، سیمینار اور ورک شاپس پوری دُنیا کے مختلف

حصوں میں منعقد کئے جاتے رہتے ہیں، جن میں مسلمان فقہاء، معیشت دان، بینکار اور کارکنان عملی مشکلات تلاش کرکے ان کے حل تلاش کرتے ہیں۔

۲۰۱:- اس کا مطلب یہ کبھی نہیں ہے کہ اسلامی بینکاری کی صنعت نے اپنی بلوغت کے انتہائی مقصد کو حاصل کرلیا ہے، یقیناً اس کی کچھ حدود ہیں، یہ بہت ساری کمزوریوں میں مبتلا بھی ہوسکتی ہے، اس کے بہت سے مسائل ابھی حل ہونا باقی بھی ہیں، لیکن اسلامی بینکوں کی اب تک ترقی کی رفتار اس غلط تصوّر کی نفی کرنے کے لئے کافی ہے کہ اسلامی بینکاری کوئی دیومالائی تصوّر (Utopian Idea) ہے، اور یہ کہ اس سمت میں پیش قدمی ہلاکت کی طرف ایک قدم ہوگا، یہ مختصر جائزہ اتنا ضرور ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی بینکاری کے میدان میں کافی حد تک زمینی کام (Ground Work) کیا جاچکا ہے، اور معیشت سے سود کے خاتمے کے امکانات پر بحث کے وقت یہ پسِ منظر نظر انداز یا بے قیمت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۲۰۲:- محترم ایم اشرف جنجوعہ صاحب (چیف اکنامک ایڈوائزر اسٹیٹ بینک آف پاکستان) کو اس مقدمے کی سماعت کے دوران اسٹیٹ بینک نے اپنا نمائندہ مقرّر کیا تھا، انہوں نے اپنے اس تحریری بیان میں، جو انہوں نے عدالت میں جمع کرایا تھا، یہ رائے دی کہ پوری معیشت کو سودی نظام سے غیرسودی نظام میں منتقل کرنا اگرچہ ممکن ہے لیکن دُنیا بھر میں کام کرنے والے پرائیویٹ اسلامی بینکوں کے عملیات (Operations) کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ اور چیلنج کرنے والا ہدف ہے۔

۲۰۳:- ہم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ پوری معیشت سے سود کا خاتمہ کسی تنہا ادارے سے سود کے خاتمے کے مقابلے میں کئی لحاظ سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہوگا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ میدان ایسے بھی ہیں جہاں سود سے پاک نظام قائم کرنا پرائیویٹ اسلامی بینکوں میں ایسا کرنے سے بہت زیادہ آسان ہوگا، دُنیا کے مختلف حصوں میں کام کرنے والے اسلامی بینک اپنے غیرسودی معاملات کی

سرانجام دہی میں اپنی حکومتوں یا مرکزی بینک کی حمایت سے محروم ہوتے ہیں، انہیں ان قانونی اور حکومتی پابندیوں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے جو بنیادی طور پر غیر سودی بینکاری کی معاونت کے لئے بنائے گئے ہیں، اور پھر اسلامی بینکوں پر ان کے اسلامی طریقہ ہائے تمویل کے موافق ذرہ برابر تبدیلی کئے بغیر ان قوانین کو مسلط کردیا جاتا ہے، اسلامی بینک اس طرح کام کر رہے ہیں کہ ان کے ہاتھ روایتی بینکاری (Conventinal Laws & Banking) کے اُصول وضوابط اور قوانین سے بندھے ہوئے ہیں، اگر حکومت بلاسودی نظام کو حکومتی سطح پر نافذ العمل کردے تو حکومت اپنے قانونی اور اُصولی ڈھانچوں کو وضع کرنے میں مکمل آزاد ہوگی، اور پرائیویٹ اسلامی بینکوں کو لاحق مشکلات حکومت کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کریں گی، مزید براں اسلامی بینکوں کو روایتی بینکوں کے ساتھ مسابقت اور مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اگر کوئی صارف اسلامی بینکوں کی پیش کردہ سہولیات سے فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتا تو وہ آسانی کے ساتھ اس کی متبادل روایتی بینکاری کی موجودہ سہولیات سے فائدہ اُٹھالیتا ہے، اگر اسلامی طریقہ ہائے تمویل کو پورے ملک پر نافذ کردیا جائے اور کوئی بینک بھی غیر اسلامی طریقۂ تمویل پیش نہ کرے، تو یہ مسئلہ بھی آسانی سے حل ہوسکتا ہے۔ تو صحیح پوزیشن یہ ہے کہ اسلامی طریقۂ بینکاری کو ملکی سطح پر نافذ کرنا بعض لحاظ سے زیادہ آسان اور دُوسری بعض لحاظ سے زیادہ مشکل ہے، حقیقت پسندی کے لئے ہمیں ان دونوں پہلوؤں کو عملِ انتقال (Transformation) کے وقت کی تعین کرتے وقت غور کرنا ہوگا، آیئے اب ہم اسلامی بینکاری کے مجوزہ نظام کے اہم ارکان پر غور کرتے ہیں۔

نفع ونقصان میں شراکت

۲۰۴:- اسلامی تمویل کی بنیادی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک متعین شرحِ سود کے بجائے نفع اور نقصان پر مبنی ہوتی ہے۔ ہم پہلے ہی قرض پر مبنی

معیشت کے تباہ کن نتائج پر غور کر چکے ہیں، اس قرض پر مبنی معیشت کی تباہ کاریوں کو محسوس کرتے ہوئے بہت سے معیشت دان یہاں تک کہ مغربی معیشت دان بھی شرکت پر مبنی تمویلی نظام کی حمایت کر رہے ہیں۔

ہم جیمس رابرٹسن کا ایک مرتبہ پھر حوالہ دیتے ہیں:-

Why has the process of issuing new money into economy (i.e. credit creation) been delegated by governments to the banks, allowing them to profit from issuing it in the form of interest-bearing loans to their customers? Should governments not issue it directly themselves, as a component of citizen's income?

Would it be desirable and possible to limit the role of interest more drastically than that, for example by converting debt into equity throughout the economy? This would be in line with Islamic teaching, and with earlier Christian teaching, that usury is a sin. Although the practical complications would make this a goal for the longer term, there are strong arguments for exploring it - the extent to which economic life world-wide now depends on ever-rising debt, the danger of economic collapse this entails, and the economic power now enjoyed by those who make money out of money rather than out of risk-bearing participation in useful enterprises.[1]

(1) James Robertson, Transforming Economic Life: A millenial Challenge. Green Books, Devon, 1998, P.57.

ترجمہ:- معیشت کے اندر نئے زر کے اجراء کا عمل (یعنی تخلیقِ زرِ اعتباری) حکومت نے بینکوں کو کیوں تفویض کر دیا ہے؟ ان کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ اپنے گاہکوں کو سودی قرضے جاری کر کے تخلیقِ زر کے عمل سے فائدہ اٹھائیں، کیا حکومت کو اسے بلاواسطہ شہریوں کی آمدنی کا حصہ بناتے ہوئے جاری نہیں کرنا چاہئے؟

کیا یہ بات زیادہ پسندیدہ اور ممکن نہیں ہوگی کہ مثال کے طور پر قرضوں کو شراکت داری میں تبدیل کر کے تیزی کے ساتھ سود کا کردار محدود کر دیا جائے؟ یہ اسلامی تعلیمات اور سابقہ عیسائی تعلیمات کے مطابق ہے کہ سود ایک گناہ ہے، اگرچہ عملی پیچیدگیاں اس کام کو طویل المیعاد مقصد کیوں نہ بنائیں، لیکن اس کے باوجود مضبوط دلائل کی بنیاد پر اس مقصد کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ یعنی جس حد تک دُنیا بھر کی معاشی زندگی روز افزوں قرضوں پر منحصر ہوتی جارہی ہے، اس میں معاشی تباہی کے جو خطرات مضمر ہیں اور معاشی طاقت کا جو تمام تر فائدہ اس وقت انہی لوگوں کو پہنچ رہا ہے جو مفید منصوبوں میں خطرہ برداشت کرنے کی بجائے روپے سے روپیہ پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

۲۰۵:- جان ٹام لینسن آکسفورڈ میں قیام پذیر کینیڈین معیشت دان ہیں، ترقی یافتہ اور کم ترقی یافتہ ممالک میں قرضوں کے اثرات کا مطالعہ و تحقیق کرتے ہوئے انہوں نے آکسفورڈ ریسرچ اور ڈیولپمنٹ کارپوریشن قائم کیا اور وہ خود اس کے چیئرمین ہیں، جس میں شرکت کے طریقے اور موجودہ قرضوں کے ذریعے کی جانے

والی تمویل کی جگہوں پر بازارِ حصص کو ترقی دینے پر تحقیق کی جا رہی ہے، اپنی کتاب (دیانت دار زر) "Honest Money" میں انہوں نے قرضوں کو حصصِ شراکت میں تبدیل کرنے کی پرزور سفارش کی ہے، ان کے نکالے ہوئے درج ذیل نتائج ان حضرات کے لئے بڑے غور طلب ہیں جو موجودہ تمویلی نظام کو جوں کا توں برقرار رکھنے پر مصر ہیں۔

Converting debt to equity is not a panacea for all economic ills. It can, however, produce many positive benefits. These benefits will not necessarily follow automatically from conversion. Concentrated effort will be required to ensure they do. Without conversion they will not happen at all.

Not the least these benefits will be those brought to the banking community itself. The banking and monetary system will not collapse. Nor should there ever need to be the threat of collapse again. Owners of banks will find the value of their shares underpinned as liabilities disappear from balance sheets and are replaced by assets of a specific value. Each and every depositor will be able simultaneously to withdraw his or her total deposits.

Demand for the bank's current or cheque account services will not diminish. Longer term depositors will now have to pay for storage: it will be a less attractive option than exchange, so the velocity with which money moves from bank to market-place to bank again, from one account to another, is likely to

increase. There will be a continuous flow of money available for new equity investment.

The market-place in general will also receive benefits. Conversion will also cause the value of money to stabilize. Saving can then retain their value. Prices need only vary according to the supply and demand of the product being priced. Measurements of exchange value made by different people at different times can be validly compared. The unit of money will once more be a valid unit of measurement of exchange value. The field of economics can become a science.

Many of the distortions which now exist in our individual frames of reference will be corrected. For instance, an investment which took an investor, ten, fifteen or twenty years to recoup used to be considered sound. Now, too often the maximum period envisaged is five years; even three. This short-term view has precluded many useful businesses from being created. The re-establishment of stable money and the emphasis on security which will bed required within equity investment program will encourage people to take a longer view. More businesses will then be considered viable and the number of new jobs can increase dramatically.

Existing savers will also be protected. The conversion to equity will eliminate the possibility of collapse for individual banks and for the system as a whole. Savings will not disappear. The nature of savings will change

from just units of money to units of money and shares. The exchange value of both the shares and the money will have to be re-assessed. But they will have value. If no actions is taken and the system collapses, they may end up having no value.

The changes proposed will also free many from the enslavement of debt. Both nations and individuals can regain their dignity. They will be free to make their own choices. No longer will managers have to face the choice between paying interest and disemploying some or not paying interest and disemploying all.

Nor shall we need to experience the stresses caused by current economic and business cycles. There will be a steady flow of money into investments. New investment opportunities will continually be sough as a home for both individual saving and business profits. Both will wish to avoid storage charges.

Growth will be dependent upon the continuing development of new ideas and new productive capacity. Growth will no longer be dependent upon the positive flow of new savings and new profits.

Re-establishing the integrity of money will eliminate at least one of the causes of human conflict. Money will no longer secretly steal from those who save, those on fixed income and those who enter long-term contracts.

Further, it can lead to a greater premium being

placed on personal integrity. The character traits of honest. honourable and forthright behaviour will be in demand. Investor's security will depend on them. Recognition of the degree of interdependence in an equity-oriented market-place can lead to more consideration of the needs of others, and, ultimately, to a more caring and, compassionate society.

Of course, life is never roses all the way. Many mistakes will be made. When new paths are trodden, the way is sometimes uncertain. Some will find it difficult to break the habitual patterns of thought which govern behaviour in a debt-oriented society. NO doubt some readers will have already experienced this.

Some will be hard-pressed when the actual exchange value or their investments becomes apparent. Yet, the conversion process can be controlled. Collapse cannot. We should be able, as part of the conversion process, to identify those who might suffer unduly. Then we can be prepared to assist them and cushion any hardship.

The case of honest money is a compelling one. Honest money is not a thief. It does not steal from the thrifty. It is not socially divisive. It does not promote economic and business cycles, creating unemployment. On the contrary, it encourages thrift. It promotes sustainable economic growth. It rewards merit. It demands integrity.

These were worthwhile goals. They can be

achieved. What is needed now is the will to make them happen.[1]

ترجمہ:- قرضوں کو حصصِ شراکت میں منتقل کرنا ہی تمام معاشی بیماریوں کا مکمل علاج نہیں ہے، تاہم یہ بہت سے مثبت منافع پیدا کرسکتا ہے، اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ یہ منافع منتقلی کے فوراً بعد نظر آنا شروع ہوجائیں، ان منافع کے پیدا ہونے کے لئے یکسو کاوشوں کی حاجت ہوگی، لیکن منتقلی کے بغیر یہ منافع بالکل پیدا نہ ہوں گے۔

وہ منافع جو ازخود بینکنگ کمیونٹی (برادری) کو حاصل ہوں گے، وہ بھی کم نہ ہوں گے، بینکاری اور مالیاتی نظام میں زوال نہیں آئے گا، اور نہ اس قسم کا کوئی خطرہ ہونا چاہئے کہ وہ دوبارہ زوال پذیر ہوگا، بینکوں کے مالکان اپنے حصص کو مضبوط قدر و قیمت والا پائیں گے، کیونکہ ان کے مطلوبات (Liabilities) ایک مخصوص قدر والے اثاثوں (Assest) سے تبدیل ہوجائیں گے۔

بینکوں کے جاری (Current) اور چیک کھاتوں (Accounts) کی خدمات کم نہیں ہوں گی، جو لوگ طویل میعاد کے لئے رقمیں بغرضِ حفاظت رکھوائیں گے، انہیں حفاظت کی فیس ادا کرنی ہوگی، روپے کو تبادلے کے لئے استعمال کرنے کے مقابلے میں یہ کم دِلکش اختیار (Option) ہوگا، لہٰذا زر کی بینکوں سے بازاروں میں اور پھر وہاں سے پھر بینکوں کے ایک کاؤنٹر سے دُوسرے کاؤنٹر میں گردش کی رفتار تیز ہوجائے گی، وہاں زر کا ایک جاری

(1) John Tomlinson: Honest Money: A Challenge of Banking. Helix 1993. PP 115. 118.

بہاؤ اسی شراکتی سرمایہ کاری (Equity Investment) کے لئے دستیاب رہے گا۔

شراکت پر مبنی نظام سے بازاروں کو بھی عمومی طور سے فائدہ ہوگا، قرض سے شرکت کی طرف منتقلی زر کی قیمت میں استحکام کا سبب بنے گی، چنانچہ بچتیں اپنی قدر و قیمت برقرار رکھ سکیں گی، قیمتوں کا اُتار چڑھاؤ کسی پیداوار کی طلب و رسد کے پیمانہ تقویم کے ذریعے ہی ہوگا، لوگوں کے مختلف زمانوں میں تبادلے کی قدر و قیمت کی پیمائش کا صحیح طریقے سے اندازہ ہو سکے گا، زر کی اکائی ایک مرتبہ پھر قدرِ تبادلہ کی پیمائش کی ایک صحیح اکائی ہوگی، معاشیات کا میدان ایک علم بن سکتا ہے۔

ایسی بہت سی خرابیاں جو ہمارے انفرادی (Frames of Reference) میں پائی جاتی ہیں، ان کی اصلاح ہو جائے گی، مثال کے طور پہ ایک سرمایہ کاری جو کسی سرمایہ کار کے نفع کے لئے دس، پندرہ، بیس سال لے لیتی تھی، پہلے کافی سمجھی جاتی تھی، اب اکثر زیادہ سے زیادہ مدت پانچ سال یا تین سال بھی متصور کی ہے، یہ قلیل المدت اندازِ فکر بہت سے مفید بزنس کی تخلیق کو ناممکن بنا چکا ہے، مضبوط زر کے دوبارہ قیام اور شراکتی سرمایہ میں خطرات سے حفاظت پر زور یہ وہ اوامر ہیں جو لوگوں کو طویل المیعاد منصوبوں میں شرکت پر اُبھاریں گے، اور زیادہ تجارتیں ممکن نظر آئیں گی اور نئی ملازمتوں کی تعداد ڈرامائی طور پر بڑھے گی۔

موجودہ بچت کرنے والے بھی محفوظ ہوں گے، شرکت میں انتقال کے ذریعے اجتماعی طور پر انفرادی بینکوں کے نظام کے زوال کا

امکان ختم ہوجائے گا، بچتیں غائب نہیں ہوں گی، بچتوں کی فطرت زَر کی چند اکائیوں سے بدل کر زَر کی اکائیوں اور حصص میں تبدیل ہوجائے گی، حصص اور زر کی تبادلہ کی قدر بھی ازسرِنو متعین کرنی پڑے گی، لیکن وہ ایک قدر و قیمت رکھیں گے، اگر کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا اور پورا نظام تباہ ہوگیا تو وہ اس طرح ختم ہوجائیں گے کہ ان کی کوئی قدر نہیں ہوگی۔

مجوّزہ ترامیم بہت سے لوگوں کو قرضوں کی غلامی سے آزاد کردیں گی، قومیں اور افراد دوبارہ اپنی عظمت حاصل کرلیں گے، وہ اپنی پسند کا راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہوں گے، اور منیجروں کو اس قسم کی چوائس کا کوئی سامنا کرنا نہیں پڑے گا کہ یا تو وہ سود ادا کریں اور کچھ ملازمین کو نکال دیں یا سود ادا نہ کریں اور سب ملازمین کو فارغ کردیں۔

اس کے علاوہ ہمیں اس دباؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جو موجودہ نظام میں تجارتی چکروں سے پیدا ہوتا ہے پر زَر کا سرمایہ کی طرف ایک مستحکم بہاؤ ہوگا، اور تجارتی نفع کے ایک مرکز کے طور پر نئی سرمایہ کاری کے مواقع تسلسل کے ساتھ تلاش کیے جائیں گے، کیونکہ انفرادی بچتوں اور تجارتی منافع میں سے ہر ایک یہ چاہے گا کہ فالتو روپیہ کو محفوظ رکھنے کی فیس ادا نہ کرنی پڑے، تیز ترقی نئے تصوّرات اور نئے پیداواری مواقع کی مسلسل ترقی پر مبنی ومنحصر ہوجائے گی، نئے قرضوں کی تخلیق پر منحصر نہیں ہوگی، معاشی ترقی نئی بچتوں اور نئے نفع کے مثبت بہاؤ پر منحصر ہوگا۔

زَر کی قدر کے دوبارہ مضبوط ہونے سے انسانی تصادم کے ایک

اہم سبب کا خاتمہ ہو جائے گا، مزید یہ کہ زَر ان لوگوں سے چپکے سے چوری نہیں ہوگا، جو طویل المیعاد معاہدوں میں سرمایہ لگاتے ہیں یا بچت کر کے رکھتے ہیں یا جن کی آمدنی متعین ہے۔

مزید یہ کہ اچھا ذاتی کردار رکھنے والوں کو فائدہ پہنچنے کا امکان زیادہ ہوگا، امانت، حرمت اور اچھے کردار کی طلب بڑھے گی، سرمایہ کاروں کی سرمایہ کاری ان پر منحصر ہوگی، شراکت پر مبنی مارکیٹ میں باہمی آزادی و استقلال کو تسلیم کرنا دُوسروں کی ضروریات کی مزید فکر کرنے کا باعث بنے گا، جس کی انتہاء مزید رحمدل اور مددگار معاشرہ کا قیام ہوگی۔

یقیناً زندگی ہمیشہ گلاب کے پھولوں پر مشتمل نہیں ہوتی، بہت سی غلطیاں بھی ہوں گی، جب نئے راستوں پر چلا جاتا ہے تو راستہ بعض اوقات غیر یقینی بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ ایسے عادی اندازِ فکر توڑنے میں مشکل محسوس کریں گے جو قرض پر مبنی معاشرے کے تحت کام کرتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض قارئین پہلے ہی اس کا تجربہ کر چکے ہیں۔

کچھ لوگوں کو جب ان کی سرمایہ کاریوں کی حقیقی قدرِ تبادلہ نظر آئے گی تو شدید دباؤ کا سامنا ہوگا، تاہم انتقال کا عمل کنٹرول کیا جاسکتا ہے، زوال کو کنٹرول نہیں کیا جاسکتا، اس عملِ انتقال کا حصہ بنتے ہوئے ہمیں ان کو شناخت کرنے کے قابل ہونا چاہئے جو بلاوجہ اس سے نقصان میں مبتلا ہوں گے، تاکہ ہم ان کی بروقت مدد کرسکیں اور ان کی تکلیف میں سہارا بن سکیں۔

امانت دار زَر کا تصوّر ایک فریضہ ہے، امانت دار زَر (Honest

(Money) کوئی ایک چور نہیں ہے، یہ چالاکی سے چوری نہیں کرتا ہے، یہ معاشرے میں تقسیم کنندہ نہیں ہے، یہ تجارتی چکروں کو فروغ دے کر بے روزگاری کا سبب نہیں بنتا، اس کے بجائے یہ اچھی کارکردگی کی ہمت افزائی کرتا اور پائیدار معاشی ترقی کو فروغ دیتا ہے، میرٹ کو نوازتا ہے اور بلند کردار کی طلب بڑھاتا ہے، یہی حقیقی مقاصد ہونے چاہئیں، یہ حاصل بھی کئے جاسکتے ہیں، بس صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ایسا عزم چاہئے جو اس کے وقوع پذیر ہونے کا سبب بن سکے۔

۲۰۶:- مائیکل روبوتھم نے ٹام لینسن کے مندرجہ بالا اقتباسات پر اپنی کتاب میں درج ذیل تبصرہ کیا ہے:-

One of the most unusual and original contributions to the monetary debate. John Tomlinson is a former merchant banker and presents a powerful case against the debt-based money system; his solution is highly creative and shows the scope of thought outside the normal parameters of monetary reform. The work is currently being incorporated by Nova University in America as part of their master degree in economics.(1)

ترجمہ:- مالیاتی ابحاث میں یہ سب سے حقیقی اور خصوصی خدمت ہے، جان ٹام لینسن ایک سابقہ مرچنٹ بینکار تھا، اس نے قرض پر مبنی معیشت کے خلاف ایک زبردست مقدمہ قائم کیا ہے، اس کا پیش کردہ حل انتہائی تخلیقی ہے، اور عام مالیاتی اصطلاحات سے

(1) Michael Rowbotham: The Grip of Death: a study of Modern Money, Jon Carpenter 1997. P. 330

پار ایک فکر کا اُفق ظاہر کرتا ہے، امریکا کی نووا یونیورسٹی نے ان کے کام کو معاشیات کی ماسٹرز کی ڈگری کا ایک حصہ بنا کر اسے تسلیم کرلیا ہے۔

۲۰۷:- فلپ پور اسلامی فائنانس پر اپنی حالیہ تحقیق میں درج ذیل مشاہدہ بیان کرتے ہیں:-

Although this long term shifts from a bond-based to an equity-based financial system accords in many respects with Islamic economic principles, it is a trend which is by no means confined to the Islamic world and which is increasingly being championed globally. The resurgence in Islamic finance worldwide is seen by some simply as a reflection of the global economy's discernible transition from bond-based to equity-based finance.

Consider, for example, the strategy of developed, non-Muslims but heavily indebted economy such as Italy. Under the terms of privatization programme which gathered momentum in 1995 and 1996, Italian law stipulates that "..... all the proceeds of the privatisation of public companies become part of a sinking fund that, by law, can only be used to retire debt, and is not applied towards the reduction of the PSBR." Perhaps, indeed, the Western world has been gravitating toward Islamic principles of finance without knowing it over the last three decades.[1]

---

(1) Philip Moore: Islamic Finance: A partnership for growth, Economy Publisher's 1997. P. 173.

ترجمہ:- اگرچہ تمسکات (بانڈز) پر مبنی معیشت کا حصص پر مبنی معیشت کی طرف انتقال کئی لحاظ سے اسلامی معاشی اُصولوں کے مطابق ہے، یہ ایک ایسا طریقہ ہے جو کسی معنیٰ میں اسلامی دُنیا کے ساتھ منحصر نہیں ہے، اور جو تیز رفتاری کے ساتھ پوری دُنیا میں پسند کیا جارہا ہے، پوری دُنیا میں اسلامی تمویل کی بیداری کی جو لہر ہے، اسے بعض حضرات اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ دُنیا بھر کی معیشت واضح طور سے قرضوں پر مبنی نظام سے شرکت کے نظام کی طرف منتقل ہو رہی ہے، اور یہ لہر اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے۔

مثال کے طور پر غور فرمائیے کہ ایک ترقی یافتہ غیر مسلم مگر قرضوں کے انتہائی بوجھ تلے دبی ہوئی اٹلی کی معیشت ہے، پرائیویٹائزیشن پروگرام کے تحت جس نے ۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء میں زور پکڑا، اطالوی قانون یہ عائد کرتا ہے کہ "..... پبلک کمپنیوں کی تمام آمدنی ایک فنڈ کا حصہ بن جائے گی، جو قانون کے تحت صرف قرضے اُتارنے (Retire) کے لئے استعمال ہوگا، اور PSBR کو کرنے کے لئے استعمال نہیں ہوگا، شاید حقیقت یہ ہے کہ مغربی دُنیا نادانستگی میں تین عشروں سے زائد عرصے سے تمویل کے اسلامی اُصولوں کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔

۲۰۸:- عالمی مالیاتی ادارہ آئی ایم ایف کے تحقیقی شعبے کے دو معیشت دان جناب عباس میراخور اور محسن ایچ خان نے غیر سودی اسلامی بینکاری کے اثرات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے، اور وہ نفع نقصان میں شرکت کے نظام پر بحث کرتے ہوئے یہ بیان کرتے ہیں:-

As shown in a recent paper by Khan (1985) this system of investment deposits is quite closely related to proposals aimed at transforming the Traditional Banking System to an equity basis made frequently in a number of countries, including the United States.(1)

ترجمہ:- جیسا کہ خان صاحب کے حالیہ (۱۹۸۵ء) مقالے سے ظاہر ہوتا ہے، سرمایہ کاری کھاتہ کا یہ نظام ان تجاویز سے کافی قریب ہے جن کا مقصد اور موضوع روایتی بینکاری نظام کو حصہ داری کے نظام میں تبدیل کرنا ہے، جو کہ بہت سارے ممالک بشمول ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔

پیٹر دار بٹسن نے بھی شرکت پر مبنی ایک تمویلی نظام کو ترجیح دی ہے، اور انہوں نے فشر منسکی بجے پریسلے اور پی ملسن کے نظریوں پر اس مقصد سے بحث کی ہے۔(2)

۲۰۹:- خلاصہ یہ کہ شرکت پر مبنی بینکاری نہ صرف اسلامی حلقوں کی طرف سے تجویز کی گئی ہے، بلکہ اسے کچھ غیر مسلم معیشت دانوں نے بھی خالص معاشی اور اقتصادی لحاظ سے تجویز کیا ہے، موجودہ قرض پر مبنی معیشت کے ذیلی اثرات اور اثراتِ بد یعنی ظلم، عدمِ استحکام اور تجارتی دھچکوں وغیرہ نے ہی ان کو اس طرف مجبور کیا کہ ایک ایسا انصاف اور حصہ داری پر مبنی نظام لایا جائے جو دولت کی منصفانہ تقسیم اور استحکام کا یقینی سبب ہو۔ شرکت پر مبنی نظامِ بینکاری میں کھاتہ داروں (Depositors) کو اس سے کہیں زیادہ نفع ملنے کی توقع کی جاتی ہے جتنی کہ وہ آج سود کی صورت میں

(1) Mohsin H. Khan and Abbas Mirakhor: Theoretical Studies in Islamic Banking & Finance. Houston 1987. P. 168.

(2) Peter Worburton: Debt and Delusion, Central Bank Follies that threaten Economy Disaster, Allen Lane, 2999. P. 224, 225.

وصول کرتے ہیں، اور پھر وہ سودی رقم بھی قرض پر مبنی زر کے پھیلاؤ کی وجہ سے افراطِ زر کے منفی اثرات کا شکار بن جاتی ہے، یہ دولت کے بہاؤ کا رُخ عام آدمی طرف کردیتی ہے، جس کے نتیجے میں بچت بڑھتی ہے اور آہستہ آہستہ توازن اور خوشحالی لاتی ہے۔

مشارکہ فائنانسنگ (تمویل) پر کچھ اعتراضات

۱:- نقصان کا رِسک

۲۱۰:- ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ مشارکہ کے ذریعے تمویل کا تقریباً مطلب یہ ہے کہ تجارت کے نقصانات تمویل کنندہ یا بینک کو منتقل کردیئے جائیں، یہ نقصان کھاتہ داروں کو بھی منتقل کیا جائے، کھاتہ دار مسلسل نقصان کے رِسک برداشت کرتے ہوئے اپنی رقموں کو بینکوں اور تمویلی اداروں میں رکھوانا پسند نہ کریں گے، اور اس طرح ان کی بچتیں یا تو بیکار ہوجائیں گی، یا پھر بینکوں سے باہر دُوسرے معاملات میں استعمال کی جائیں گی، جس کا نتیجہ قومی سطح پر ترقی میں عدم معاونت ہوگا۔

۲۱۱:- یہ دلیل درحقیقت غلط مفروضہ ہے، مشارکہ کی بنیاد پر تمویل سے قبل بینک اور مالیاتی ادارے اس مجوزہ تجارت کے امکانات (Feasibility) پر غور کریں گے جس کے لئے یہ سرمایہ درکار ہے، یہاں تک کہ موجودی سودی بینکاری نظام میں بھی بینک ہر ایک اپیل کنندہ کو قرضے نہیں دیتے، وہ نہ صرف صارف کی مالیاتی حالت کا مطالعہ کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات انہیں اس تجارت کے مختلف امکانات کا جائزہ بھی لینا پڑتا ہے، اور اگر انہیں یہ خدشہ ہو کہ تجارت قابلِ نفع نہیں ہے، تو وہ قرضہ دینے سے انکار کردیتے ہیں، مشارکہ میں انہیں یہ تحقیق اور زیادہ پیمانے پر گہرائی میں جاکر احتیاط کے ساتھ کرنی ہوگی، لیکن یہ اضافی کام یقیناً ملکی معیشت کے لئے مجموعی طور پر مفید اور معاون ہوگا۔

۲۱۲:- مزید براں کوئی بھی بینک یا تمویلی ادارہ اپنے آپ کو صرف مشارکہ پر محدود نہیں کرسکتا، بلکہ وہاں پر ہمیشہ مشارکہ کا ایک فنڈ (Protfolio) ہوگا، اگر بینک نے اپنے ۱۰۰ صارفین (Clients) کو مشارکہ کی بنیاد پر تمویل کیا، تو ان میں سے ہر ایک صارف کی تجویز کے امکانیات (Feasibility) کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ناقابلِ تصور ہے کہ ان میں سے تمام یا اکثر نقصان کا سبب بنیں گے، مناسب اقدامات اور ضروری احتیاطوں کے بعد زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض میں نقصان ہوجائے، لیکن اس کے برخلاف نفع آور مشارکہ سود پر مبنی قرضوں کے مقابلے میں بہت زیادہ نفع کا بھی سبب بنے گا، کیونکہ اس صورت میں صارف اور بینک کے درمیان حقیقی نفع تقسیم ہوگا، اسی لئے مشارکہ کے فنڈ (Protfolio) کے بارے میں مجموعی طور پر یہ اُمید نہیں ہے کہ وہ نقصان کا شکار ہوجائے گا، بلکہ یہ صرف ایک منطقی امکان ہے، جس کی بنیاد پر کھاتہ داروں کو دِل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے، نقصان کا یہ نظریاتی امکان ان مشترک سرمایہ کی کمپنیوں (Joint Stock Companies) کے نقصان کے امکان کے مقابلے میں بہت کم ہے جن کا تمام تر کاروبار مخصوص تجارتی سرگرمیوں تک محدود ہے، اس کے باوجود بھی لوگ اس کے شیئرز خریدتے ہیں اور نقصان کا امکان انہیں ان حصص کے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنے سے منع نہیں کرتا۔ بینکوں اور مالیاتی اداروں کے مشارکہ کا معاملہ بہت مختلف ہے، کیونکہ ان کے مشارکہ کے تحت سرگرمیاں اتنی متنوع ہوں گی کہ اگر بالفرض کسی ایک مشارکہ سے نقصان بھی ہوگیا تو اس کی تلافی دُوسرے مشارکہ کے کثیر نفع سے ہوجائے گی۔ پاکستانی بینکوں کا تجربہ ایک مشاہداتی تجربہ ہے، ۱/۷/۱۹۹۵ء سے پاکستان کے تمام بینکوں کے کھاتے کرنٹ اکاؤنٹ کے ماسوا نفع نقصان میں شرکت پر مبنی ہیں، بینکوں کی طرف سے کھاتہ داروں کو ان کے اصل سرمایہ کی بھی گارنٹی یا ضمانت فراہم نہیں کی جاتی، لہٰذا ہمارے موجودہ بینکوں کی مطلوبات (Liabilities Side) مکمل طور پر شرکت پر مبنی ہے، اس

کے باوجود کھاتے اسی طرح برقرار ہیں جیسے وہ پہلے تھے۔

۲۱۳:- اس کے علاوہ ایک اسلامی معیشت کو یہ ذہنیت پیدا کرنی چاہئے جو اس بات پر یقین کرے کہ جو کوئی نفع کسی زَر پر کمایا جائے وہ تجارت کا رِسک برداشت کرنے کا انعام ہونا چاہئے، یہ رِسک ماہروں کے ذریعے اور تجارتوں کے تنوع کے ذریعے کم ہوکر صرف فرضی اور نظریاتی رِسک رہ جاتا ہے، تاہم اس رِسک کو بھی مکمل طور پر ختم کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، وہ ایک شخص جو نفع کمانا چاہتا ہو اسے اس کم سے کم رِسک کو ضرور قبول کرلینا چاہئے، چونکہ یہ تصور عموماً مشترک سرمایہ کی کمپنیوں میں پہلے سے موجود ہے، لہٰذا اس میں کبھی کوئی یہ اعتراض نہیں کرتا کہ شرکاء کے سرمایہ کو نقصان ہوگیا، یہ مشکل اسی نظام میں پیدا ہوتی ہے جب بینکاری اور تمویل کو عام تجارتی سرگرمیوں سے الگ قرار دیا جاتا ہے، اور جب یہ یقین کیا جاتا ہے کہ بینک اور تمویلی ادارے صرف زَر اور کاغذ کی حد تک معاملات کرتے ہیں، اور تجارت اور صنعت کے حقیقی نتائج سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہی وہ بنیادی اُصول ہے کہ جس کی بنیاد پر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ وہ ہر حالت میں ایک متعین نفع کے حقدار ہوتے ہیں۔ تمویلی شعبے کی تجارت وصنعت کے شعبے سے لازمی علیحدگی معیشت پر بحیثیت مجموعی عظیم نقصان کا سبب بنی ہے، ظاہر ہے کہ جب ہم ''اسلامی بینکاری'' کا لفظ بولتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس روایتی نظام کے ہر پہلو میں، ہر طرح سے اس کا اتباع کرے گا، اسلام کے اپنے اُصول و اقدار ہیں، جن کا تمویل (فائنانسنگ) اور صنعت وتجارت میں افتراق و علیحدگی پر ایمان نہیں ہے، ایک مرتبہ جب یہ اسلامی نظام سمجھ لیا جائے تو لوگ نقصان کے نظریاتی امکان کے باوجود نفع آور مشترک سرمایہ کی کمپنیوں میں سرمایہ کاری سے زائد اس میدان میں سرمایہ کاری کریں گے۔

۲:- خیانت (Dishonesty)

۲۱۴:- مشارکہ فائنانسنگ کے خلاف ایک دُوسرا خدشہ یہ کیا جاتا ہے کہ

خائن لوگ تمویل کنندگان (Financeirs) کو عقدِ مشارکہ میں نفع ادا نہ کر کے استحصال (Exploit) کریں گے، وہ ہمیشہ یہ ظاہر کر سکتے ہیں کہ تجارت نے کوئی نفع نہ کمایا، بلکہ وہ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ انہیں نقصان ہوگیا کہ جس میں بعض اوقات نہ صرف نفع بلکہ اصل سرمایہ بھی ڈوب گیا۔

۲۱۵:- اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک جائز اور صحیح خدشہ ہے، خصوصاً ایسے معاشروں میں جہاں پر خیانت روزمرہ کا معمول ہے، تاہم اس مسئلے کا حل اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کہ عموماً سمجھا یا بیان کیا جاتا ہے۔

۲۱۶:- اگر ملک کے تمام بینک مرکزی بینک اور حکومت کی محتاط پشت پناہی کے ساتھ خالص اسلامی طریقے سے چلائے جائیں تو پھر خیانت کے مسئلے پر قابو پانا بہت زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے تو کریڈٹ ریٹنگ کے نظام کو بھرپور طریقے سے نافذ العمل کرنا ہوگا، ہر کمپنی اور شراکتی ادارے کو قانون کی طرف سے آزاد کریڈٹ ریٹنگ پر مجبور کیا جانا چاہئے، یہاں تک کہ ایسی بڑی بڑی فرمیں جو متعینہ مقدار سے زائد تمویل چاہ رہی ہوں ان کو بھی اسی قانون کا تابعدار بنانا ہوگا، دوسرے یہ کہ آڈیٹنگ کا ایک بہترین منظم نظام بھی نافذ العمل کیا جائے گا، جہاں پر تمام صارفین کے اکاؤنٹس اچھی طرح مرتب اور کنٹرول کئے جائیں۔ بعض علماء کی رائے کے مطابق نفع کو خام (Gross) نفع کی بنیاد پر بھی شمار (Calculate) کیا جاسکتا ہے، تاہم اگر کبھی کسی صارف سے کوئی بددیانتی، خلاف ورزی یا غفلت سرزد ہوجائے تو اسے تعزیری اقدامات کا مستوجب قرار دیا جائے اور اسے آئندہ کم از کم ایک مخصوص مدت کے لئے کسی بھی بینک سے اس قسم کی سہولت (Facility) سے محروم کردیا جائے۔

۲۱۷:- اس قسم کے اقدامات حقیقی منافع کو چھپانے یا کوئی دوسرا عملِ خیانت سرانجام دینے کے لئے ایک مضبوط مانع (Deterrent) ثابت ہوں گے، اس کے علاوہ کسی بھی بینک کے صارفین مستقل مصنوعی نقصانات ظاہر کرنے کے متحمل نہیں ہوں

گے، کیونکہ یہ کئی لحاظ سے ان کے مفاد کے خلاف ہوگا۔ یہ بات سچ ہے کہ تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود بعض اوقات کوئی خائن صارف اپنے مذموم منصوبے میں کامیاب ہوسکتا ہے، لیکن تعزیری اقدامات اور تجارت کی عام فضا تدریجاً اس قسم کے واقعات کو کم کردے گی (یہاں تک کہ ایک سود پر مبنی معیشت میں بھی نادہندگان ہمیشہ بُرے قرضوں (Bad Debts) کے مسائل پیدا کرتے رہتے ہیں)، لیکن اسے پورے مشارکہ کے نظام کو مسترد کرنے کا عذر یا علت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

عقدِ مرابحہ

۲۱۸:۔ مزید براں اسلامی بینک نفع نقصان میں شرکت تک محدود نہیں ہیں، اگرچہ مشارکہ ایک سب سے پسندیدہ طریقۂ تمویل ہے، جو کہ نہ صرف اسلامی فقہ کے اُصولوں کے عین مطابق ہے بلکہ اسلامی معیشت کے بنیادی فلسفے کے بھی مطابق ہے، اس کے باوجود چند ایسے متنوع قسم کے طریقہ ہائے تمویل مثلاً مرابحہ، اجارہ، سلم، استصناع وغیرہ بھی موجود ہیں، کہ جن کو بینکوں کے اثاثوں کی جگہ (Assets Side) میں استعمال کیا جاسکتا ہے، ان طریقوں میں سے چند ایک کم خطرے والے ہیں اور انہیں ان مواقع پر اختیار کیا جاسکتا ہے جہاں مشارکہ غیر معمولی رِسک رکھتا ہو یا کسی مخصوص معاملے میں استعمال نہیں کیا جاسکتا ہو۔ بعض اپیل کنندگان نے یہ شکایت بھی کی کہ وفاقی شرعی عدالت نے اپنے زیرِ نظر فیصلے میں یہ اعلان کیا ہے کہ مارک اَپ کا نظام بھی اسلامی اَحکامات کے خلاف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مرابحہ جائز طریقۂ تمویل کے طور پر اسلامی بینکوں میں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

۲۱۹:۔ یہ شکایت بھی غلط مفروضہ ہے، وفاقی شرعی عدالت نے اُصولی طور پر عقدِ مرابحہ کو ناجائز قرار نہیں دیا ہے، بلکہ اس کے برعکس اس نے اپنے فیصلے میں برآمدات کی تمویل کے ضمن میں پیراگراف نمبر ۳۶۷ میں مرابحہ کا طریقہ تجویز بھی کیا ہے، تاہم عدالت ''مروّجہ مارک اَپ'' کے نظام کو اسلامی اُصولوں سے متصادم قرار

دیتی ہے، اور اس خدشے کا اظہار کرتی ہے کہ یہ طریقہ بھی غلط طریقے سے استعمال کیا جائے گا، اور اس کو بڑے پیمانے پر اس کی ضروری شرائط کی تکمیل کئے بغیر نافذ کردیا جائے گا، تو یہ موجودہ نظام میں کوئی تبدیلی نہیں لائے گا۔

ہم پہلے ہی اس بات کا تذکرہ کرچکے ہیں کہ پاکستان میں موجود مارک اَپ کا نظام کسی بھی معنیٰ میں مرابحہ نہیں ہے، یہ تو صرف نام کی تبدیلی ہے، نام نہاد تجارتِ اشیاء حقیقت میں کبھی انجام نہیں پاتی، اگر مرابحہ اپنی تمام ضروری شرائط کے ساتھ نافذ کیا جائے تو یہ شریعت میں ناجائز نہیں ہے، اور نہ خود وفاقی شرعی عدالت نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ ہم پہلے ہی حرمتِ رِبا کے بارے میں منکرین کے اس اعتراض کہ تجارت بھی رِبا کی مانند ہے کے پسِ منظر میں (اس فیصلے کا پیراگراف نمبر ۵۰ اور ۵۱) یہ بیان کرچکے ہیں کہ وہ اشیاء کو اُدھار پر زیادہ قیمت کے ساتھ فروخت کیا کرتے تھے، ان کا اعتراض یہی تھا کہ وہ جب قیمت کسی تجارت کے ابتدائی مرحلے پر بڑھاتے ہیں تو اسے حرام قرار نہیں دیا جاتا، لیکن جب خریدار وقتِ مقررّہ پر قیمت ادا کرنے سے قاصر ہوجائے اور وہ کوئی اضافی رقم اضافی مدّت کے عوض ادا کرے تو اسے رِبا اور حرام قرار دیا جاتا ہے، تو قرآنِ کریم نے اس اعتراض کا یہ کہہ کر جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور رِبا کو حرام قرار دیا ہے۔

جیسا کہ سابق میں (اس فیصلے کے پیراگراف نمبر ۱۹۰ میں) بیان کیا گیا ہے، مرابحہ درحقیقت ایک تجارت ہے، وہ اپنی اصل کے لحاظ سے طریقۂ تمویل نہیں ہے، لہٰذا اس میں تجارت کے تمام بنیادی اُصولوں کو پورا کرنا ہوگا، اسے صرف اس صورت میں استعمال کیا جائے گا جہاں پر صارف کو کوئی چیز خریدنی ہو، بینک کو اسے اصل فروخت کنندہ (Supplier) سے خریدنا ہوگا، اور پھر اس کی ملکیت اور قبضہ (حقیقی یا حکمی) لینے کے بعد اسے صارف کو فروخت کرنا ہوگا، یہ تمام اجزاء ایک جائز مرابحہ میں اپنے تمام قانونی اور منطقی اثرات کے ساتھ موجود ہونا ضروری ہیں، بالخصوص بینک

کو اتنے عرصے تک اس چیز کا رسک برداشت کرنا ضروری ہے جتنے عرصے وہ چیز اس کی ملکیت اور قبضے میں رہتی ہے، یہی وہ بنیادی اوصاف ہیں جو عقدِ مرابحہ کو سود پر مبنی تمویل سے ممتاز کرتے ہیں، لیکن اگر ایک مرتبہ بھی انہیں نظرانداز کر دیا گیا، خواہ آسانی کی خاطر، تو پھر یہ پورا عقد سود پر مبنی تمویل کے میدان میں داخل ہو جائے گا۔

۲۲۰:- عقدِ مرابحہ پر ایک یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب اس کو طریقۂ تمویل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو اُدھار کی صورت میں ایک اضافی یا زائد قیمت عائد کی جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ عقدِ مرابحہ کی صورت میں کسی چیز کی قیمت نقد بازاری قیمت سے زائد ہوتی ہے، چونکہ قیمت اس وقت کے عوض زیادہ کی گئی ہے جو وقت خریدار کو دیا گیا ہے، لہٰذا یہ سود پر مبنی عقدِ قرض کے مشابہ ہو گیا۔

۲۲۱:- ہم اس فیصلے کے پیراگراف نمبر ۱۳۶ تا ۱۴۰ میں یہ بات پیچھے ذکر کر چکے ہیں کہ اسلام نے زَر اور شے کے ساتھ مختلف انداز میں برتاؤ اور معاملہ کیا ہے، دونوں کے مختلف اوصاف ہونے کی وجہ سے دونوں مختلف اُصول وقواعد کے محتاج ہیں، چونکہ زَر کی اپنی کوئی ذاتی قدر نہیں ہوتی، بلکہ یہ صرف ایک ایسا آلۂ تبادلہ ہے جس کے کوئی مختلف اوصاف نہیں ہوتے، زَر کی ایک اکائی کو اگر اسی مالیت زَر کی دُوسری ایک اکائی سے تبادلہ کیا جائے تو وہ صرف قیمتِ اسمیہ (Par Value) پر ہی ہوسکتا ہے، اگر ایک ہزار پاکستانی روپے کا ایک کرنسی نوٹ دُوسرے پاکستانی نوٹ سے مبادلہ کیا جائے تو پھر اسے بھی ضرور ایک ہزار روپے کی مالیت کا ہی ہونا چاہئے، نوٹ کی قیمت حتیٰ کہ نقد فروختگی میں بھی ایک ہزار سے نہ تو بڑھ سکتی ہے اور نہ ہی کم ہوسکتی ہے، کیونکہ کرنسی نوٹ کی کوئی ذاتی منفعت یا اس میں کوئی مختلف اوصاف (قانوناً معتبر) نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ بغیر کسی عوض کے کسی ایک جانب میں کوئی اضافہ شرعاً جائز نہیں ہے، جب یہ بات نقد معاملے میں صحیح ہے تو پھر یہ بات اُدھار معاملے میں بھی صحیح ہونی چاہئے جہاں پر دونوں طرف زَر ہوتا ہے، کیونکہ اگر اُدھار کے معاملے

میں ایسا کوئی اضافہ طلب کیا گیا (جہاں پر صرف زَر کا زَر سے تبادلہ ہو رہا ہو) تو پھر یہ اضافہ وقت کے سوا کسی چیز کا بدلہ نہیں ہوگا۔

۲۲۲:- عام اشیاء کا معاملہ مختلف ہے، چونکہ وہ اپنی ذاتی منفعت اور مختلف اوصاف رکھتی ہیں، تو ان کا مالک انہیں طلب و رسد کے قوانین کے تحت جس قیمت پر فروخت کرنا چاہے، فروخت کرسکتا ہے، اگر کوئی فروخت کنندہ کسی فریب یا غلط بیانی سے کام نہ لے تو وہ اپنی چیز بازاری قیمت سے زائد قیمت پر فروخت کرسکتا ہے، بشرطیکہ خریدار اس پر راضی ہو۔ اگر خریدار اسے اس اضافی قیمت پر خریدنے پر راضی ہوتو وہ اضافی رقم فروخت کنندہ کے لئے اس سے وصول کرنا بالکل جائز ہے، جب کوئی فروخت کنندہ کوئی چیز کسی اضافی قیمت کے ساتھ نقد فروخت کرسکتا ہے تو پھر اضافی وقت کے ساتھ اُدھار پر بھی فروخت کرسکتا ہے، بشرطیکہ وہ غلط بیانی سے کام نہ لے اور نہ ہی اسے خریدنے پر مجبور کرے اور خریدار اسے خریدنے پر اپنی آزادی کے ساتھ راضی ہو۔

۲۲۳:- بعض اوقات یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ نقد کی صورت میں قیمتوں میں اضافہ اُدھار ادائیگی پر مبنی نہیں ہے، لہٰذا یہ جائز ہے، البتہ اُدھار ادائیگی پر مبنی خرید و فروخت میں قیمتوں میں اضافہ خالص وقت کی وجہ سے ہے، چنانچہ یہ سود کے بالکل مشابہ ہے۔ یہ دلیل بھی اس غلط تصور پر مبنی ہے کہ جب بھی قیمت میں وقتِ ادائیگی کے پیشِ نظر اضافہ کیا جاتا ہےتو یہ سود کی تعریف میں داخل ہوجاتا ہے، یہ تصور بالکل غلط ہے، کوئی بھی اضافی رقم جو تأخیر سے ادائیگی کی صورت میں عائد کی جائے وہ صرف اس وقت رِبا بنتی ہے جبکہ دونوں جانب تبادلہ نقدی یا زَر کا ہو، لیکن اگر کوئی چیز کسی زر کے مدمقابل فروخت کی جارہی ہو تو بوقتِ تعینِ قیمت، فروخت کنندہ بشمول وقتِ ادائیگی کے بہت سارے عوامل اپنے مدِنظر رکھتا ہے، ایک فروخت کنندہ کسی ایسی چیز کا مالک ہونے کی حیثیت سے جو اپنی ذاتی منفعت و افادیت رکھتی ہو، ایک سے زیادہ

قیمت عائد کرسکتا ہے، اور خریدار بھی اسے ادا کرنے پر مختلف وجوہ سے راضی ہوسکتا ہے، مثلاً:-

(۱) اس کی دُکان خریدار سے کافی قریب ہو کہ وہ اس مارکیٹ میں جانا نہ چاہتا ہو جو اس سے اتنی نزدیک نہ ہو۔

(۲) یہ فروخت کنندہ خریدار کے لئے دُوسروں کے مقابلے میں زیادہ قابلِ اعتماد و بھروسہ ہو اور خریدار کو بھی اس پر یہ مکمل بھروسہ ہو کہ فروخت کنندہ اسے وہ چیز کسی بھی نقصان یا خرابی کے بغیر فروخت کرے گا۔

(۳) فروخت کنندہ اسے ایسی چیز کو جس کی طلب زیادہ ہو فروخت کرتے ہوئے دُوسرے خریداروں کے مقابلے میں ترجیح زیادہ دیتا ہو۔

(۴) اس فروخت کنندہ کی دُکان کی فضاء دُوسری دُکانوں کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھری اور خوش نما ہو۔

(۵) یہ فروخت کنندہ دُوسروں کے مقابلے میں زیادہ بااخلاق ہو۔

۲۲۴:- یہ اور اس طرح کے دُوسرے اسباب گاہک سے اضافی رقم وصول کرنے کا سبب بن سکتے ہیں، اسی طرح اگر فروخت کنندہ اس وجہ سے قیمت بڑھائے کہ خریدار کے لئے اُدھار کی بھی اجازت دے رہا ہے تو یہ شرعاً ناجائز نہیں ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی دھوکا، فریب نہ ہو، اور خریدار اسے کھلی آنکھوں قبول کرے، کیونکہ اس صورت میں خواہ قیمت میں اضافے کا کوئی بھی سبب ہو اس کے باوجود مکمل قیمت کسی جنس (Commodity) کے بدلے ہے نہ کہ زر اور نقدی کے بدلے۔ یہ صحیح ہے کہ بوقتِ اضافہ قیمت فروخت کنندہ نے اپنے مدِنظر ادائیگیٔ قیمت کا وقت بھی رکھا ہوگا، لیکن ایک مرتبہ جب قیمت متعین ہوگئی تو اب وہ اجناس یا اشیاء سے وابستہ ہوگئی نہ کہ وقت سے، چنانچہ اب وہ قیمت متعین ہوچکی ہے اور وہ فروخت کنندہ کی طرف سے کبھی بڑھائی نہیں جاسکتی، اگر یہ اضافی قیمت وقت کے عوض ہوتی تو اس صورت

میں جب فروخت کنندہ اسے ادائیگی کے لئے مزید وقت کی مہلت دیتا تو قیمت میں اضافہ کرنا ممکن ہوتا۔

۲۲۵:- اس بات کو ایک اور رُخ سے دیکھئے، جیسا کہ سابق میں ذکر کیا گیا چونکہ زَر صرف قیمتِ اسمیہ پر ہی فروخت ہوسکتا ہے، تو (زَر کو زَر سے) اُدھار فروخت یا تبادلے کی صورت میں اضافی قیمت یا رقم صرف وقت کے عوض ہی ہوگی، چنانچہ اگر مقروض کو قرض کی میعاد (Maturity) پوری ہونے پر مزید وقت کی مہلت دی جائے تو قرض خواہ عموماً اس سے مزید رقم کا مطالبہ کرتا ہے، اس کے برخلاف کسی چیز کی اُدھار فروخت کی صورت میں تعیینِ قیمت کے وقت صرف وقت ہی خصوصی بدل یا عوض نہیں ہے، قیمت کسی شے کے بدلے متعین کی گئی ہے، نہ کہ وقت کے بدلے، تاہم اس چیز کی فروختگی میں وقت پیچھے ذکر کردہ عوامل کی طرح ایک اضافی عامل کا کردار تو ادا کرتا ہے لیکن ایک مرتبہ جب اس عامل نے اپنا کردار ادا کردیا تو اب اس قیمت کا ہر ہر حصہ اس چیز کی طرف منسوب ہوگا۔

۲۲۶:- اس مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب زَر کا زَر کے ذریعے تبادلہ کیا جائے تو کوئی اضافی رقم جائز نہیں ہے، نہ نقد معاملے کی صورت میں اور نہ اُدھار کی صورت میں، لیکن جب ایک شے کسی زَر کے بدلے فروخت کی جارہی ہو تو فریقین کی طے کردہ قیمت بازاری قیمت کے مقابلے میں نقد اور اُدھار دونوں صورت میں زیادہ مقرر کی جاسکتی ہے، کسی چیز کی قیمت متعین کرتے وقت ادائیگی کا وقت ایک اضافی عامل بھی بن سکتا ہے، لیکن یہ زَر کے زَر سے تبادلے کی صورت میں اضافی رقم کے مطالبے کے لئے خصوصی بنیاد یا مکمل عوض نہیں بن سکتا۔

۲۲۷:- مذکورہ بالا صورتِ حال مذاہبِ اربعہ اور جمہور فقہاء نے تسلیم کی ہے، یہی شریعت میں مرابحہ کی صحیح قانونی صورتِ حال ہے، تاہم دو نکات ہمیشہ یاد رکھنے چاہئیں:-

(۱) مرابحہ کو جب ایک تجارتی تمویل کے طریقے کے طور پر استعمال کیا جائے تو یہ ایسی سرحد پر واقع عقد ہے کہ جس کے اور سودی قرضے کے درمیان شناخت کے خطوط بہت باریک ہیں، شناخت کی یہ باریک لکیریں صرف اسی وقت نظر آسکتی ہیں جب ان تمام بنیادی شرائطِ مرابحہ کو ملحوظ رکھ کر عقد کیا جائے جو پیچھے ذکر کی گئی ہیں، ان میں سے کسی ایک سے غفلت برتنے کی صورت میں یہ عقد سودی تمویل میں بدل جائے گا، لہٰذا اس عقد کو ضروری احتیاط اور توجہ کے ساتھ سرانجام دیئے جانے کی ضرورت ہے۔

(۲) عقدِ مرابحہ کے جواز کے باوجود یہ غلط استعمال کا باعث بن سکتا ہے، اور اسلام کے تمویلی نظام کے فلسفے کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ ایک آئیڈیل طریقۂ تمویل نہیں ہے، لہٰذا اسے صرف انہی صورتوں میں اختیار کرنا چاہئے جہاں مشارکہ اور مضاربہ قابلِ استعمال نہ ہوں۔

۲۲۸:- مشارکہ اور مضاربہ کے علاوہ کچھ دُوسرے طریقہ ہائے تمویل بھی مختلف قسم کی تمویل میں اختیار کئے جاسکتے ہیں، مثلاً اجارہ (Leasing)، سلم اور استصناع وغیرہ۔ ہمیں ان کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ ان مختلف رپورٹوں میں تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں جو سود کے خاتمے سے متعلق حکومت کو پیش کی گئی ہیں، اس سلسلے میں سب سے تفصیلی رپورٹ ۱۹۸۰ء میں اسلامی نظریاتی کونسل نے پیش کی تھی، دُوسری رپورٹ شریعت ایکٹ کے مطابق بنائے گئے اسلامائزیشن کمیشن آف اکانومی نے پیش کی تھی، یہ کمیشن بھی اپنی جامع رپورٹ حکومت کو ۱۹۹۱ء میں پیش کرچکا ہے، آخر میں اسی کمیشن کو دوبارہ راجہ ظفر الحق کی سربراہی میں دوبارہ بنایا گیا، جس نے اپنی آخری رپورٹ ۱۹۹۷ء میں داخل کی۔

ہم ان تمام رپورٹوں کا مطالعہ کرچکے ہیں، ہم ان رپورٹوں میں موجود ہر تفصیلی تجویز پر تبصرہ کئے بغیر اس بات پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ ان تمام

رپورٹوں کو موجودہ تمویلی نظام تبدیل کرنے کا بنیادی زمینی کام قرار دینا چاہئے۔

۲۲۹:- اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نظریۂ ضرورت کو موجودہ سودی نظام کو ایک غیر محدود وقت یا ہمیشہ کے لئے بچانے کے واسطے لاگو نہیں کیا جاسکتا، تاہم یہ نظریۂ ضرورت صرف اس نظام کو سود سے غیر سودی نظام میں تبدیل کرنے کے لئے حکومت کو درکار ایک مناسب وقت کی اجازت دینے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

حکومت کے قرضے

۲۳۰:- سود کے خاتمے کے سلسلے میں ایک بڑی مشکل حکومتی قرضوں کو قرار دیا جارہا ہے، موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان ملکی اور غیر ملکی قرضوں میں جکڑی ہوئی ہے، جہاں تک ملکی قرضوں کا تعلق ہے، ان کو اسلامی طریقہ ہائے تمویل میں تبدیل کرنے کے بارے میں مذکورہ بالا رپورٹوں میں تفصیلی طریقۂ کار مذکور ہے۔ ڈاکٹر وقار مسعود خان صاحب جو عالمی یونیورسٹی اسلام آباد کے نائب صدر ہیں، وہ اس مقدمے میں عدالتی مشیر کی حیثیت سے پیش ہوئے، اور انہوں نے اس اہم مسئلے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اس شعبے (Sector) سے سود کے خاتمے کا لائحہ عمل پیش کیا، ان کے عدالت میں پیش کردہ بیان کے صفحہ:۲۹ تا ۴۹ میں انہوں نے اس مسئلے پر بحث کی ہے، ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام حکومتی اندرونی قرضے پروجیکٹ فائنانس کی بنیاد پر ڈیزائن کرنے چاہئیں، یہ طریقہ شریعت کے مطابق ہونے کی وجہ سے قرضوں پر حاصل شدہ رقوم کی خرد بُرد، خیانت اور غلط استعمال سے روکنے میں مددگار ہوگا، اس مواد پر غور کرنے کے بعد ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ اس شعبے (Sector) میں بھی سود کے غیر معین مدت تک جاری رہنے کی ضرورت نہیں ہے، تاہم اس وجہ سے اس شعبے کو اسلامی طریقے سے بدلنے کے لئے بینکاری کے پرائیویٹ معاملات کی بہ نسبت زیادہ مہلت کی ضرورت ہوسکتی ہے۔

غیر ملکی قرضے

۲۳۱:- اگر چہ موجودہ مقدمے میں غیر ملکی قرضوں سے متعلق قوانین بطور خاص زیرِ بحث نہیں ہیں، لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ اگر ایک مرتبہ سود کو ناجائز قرار دے دیا گیا تو یہ قوانین بھی کسی لحاظ سے ممانعت کی زَد میں آئیں گے، یہ سب سے زیادہ مشکل علاقہ معلوم ہوتا ہے جہاں پر سودی نظام کی حرمت کو نافذ العمل کیا جائے۔ حکومتی غیر ملکی قرضے ۱/۳/۱۹۹۹ء کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۵ء۳۱ بلین ڈالرز یا ۱۶۱۰ بلین روپے انٹر بینک ریٹ کے مطابق ہیں، یہ دلیل دی جارہی ہے کہ اس قسم کے قرضوں کو غیر سودی قرضوں میں بدلنا تقریباً ناممکن ہے۔

۲۳۲:- اس سے قبل کہ ہم اس مسئلے کے اسلامی حل پر غور کریں، ہمیں اس بات کو مدِنظر رکھنا ہوگا کہ غیر ملکی قرضوں کی مقدار میں جس تیز رفتاری سے اضافہ ہو رہا ہے اس پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے، ابتدا میں ہم نے بین الاقوامی ذرائع سے ترقیاتی منصوبوں کے لئے قرضے لئے، بعد میں غیر ملکی قرضوں کا دائرہ غیر ترقیاتی اخراجات تک بڑھادیا گیا، اس کے بعد بہت بھاری مقدار میں قرضے چکانے (Debt Servicing) کے لئے، لئے گئے، اب یہ قرضے بین الاقوامی قرض خواہوں کو سود ادا کرنے کے واسطے لئے جارہے ہیں۔

۲۳۳:- اس بات کا احساس کرنے کے لئے معاشیات کے کسی ماہر کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ ایک ایسی خطرہ کی گھنٹی ہے کہ ہماری قوم کو ہمارے قرض خواہوں کی غلامی کی طرف لے جارہی ہے، ہم ہر سال بھاری قرضے لے کر اپنی موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کو گروی (رہن) رکھوا رہے ہیں، یہ خیال کہ غیر ملکی قرضے ترقی پذیر ممالک کے ترقی کے منصوبوں میں مددگار ہوتے اور خوشحالی لانے کا سبب بنتے ہیں، تیسری دُنیا کے بہت سارے ممالک کی حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے جھوٹا اور غلط

معلوم ہوتا ہے، اس خیال کا بڑھتا ہوا احساس آزاد معیشت دان کر رہے ہیں۔

سوسن جورج فرانس میں رہنے والی ایک امریکی معیشت دان ہیں، انہوں نے عالمی مسائل اور ترقی پر کافی لکھا ہے، وہ ایمسٹرڈم کے ٹرانز نیشنل انسٹی ٹیوٹ کی ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر بھی ہیں، اور ان کی تیسری دُنیا کے قرضے کے موضوع پر کتابوں کی کافی ستائش بھی کی گئی ہے، ان میں سے بعض نے عالمی تمغے (Awards) بھی حاصل کئے ہیں، انہوں نے تیسری دُنیا کے قرضوں کے آنکھیں کھول دینے والے نتائج کا درج ذیل خلاصہ نکالا ہے:-

According to the OECD, between 1982 and 1990, total resource flows to developing countries amounted to $ 927 billion. This sum includes OECD categories of Official Development Finance, Export Credits and Private Flows, in other words, all official bilateral and multilateral aid, grants by private charities, trade credits plus direct private investment and bank loans. Much of this inflow was not in the form of grants but was rather new debt, on which dividends or interest will naturally come due in future.

During the same 1982 - 92 period, developing countries remitted in debt service alone 1342 billion (interest and principal) to the creditor countries. For a true picture of resource flows, one would have to add many other South - to - North out - flows, such as royalties, dividends, repatriated profits, underpaid raw materials and the like. The income - outflow difference between $ 1345 and $ 927 billion is thus a much understated $ 418 billion in the rich

countries' favour. For purposes of comparison, the US Marshall Plan transferred $ 14 billion in 1948 to war - ravaged Europe, about $ 70 billion in 1991. Thus in the eight years from 1982 - 90, the poor have financed six Marshall Plans for the rich through debt service alone. .
Have these extraordinary outflows at least served to reduce the absolute size of the debt burden? Unfortunately not. Inspite of total debt service, including amortization, of more than 1.3 trillion dollars from 1982 - 90, the debtor countries as a group began the 1990s fully 61 percent more in debt than they were in 1982. Sub-Saharan Africa's debt increased by 113 percent during this period; the debt burden of the very purest - the so-called 'LLDCs' or 'least developed' countries - was up by 110 percent.[1]

ترجمہ:- OECD کے مطابق ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۰ء تک تمام ترقی پذیر ممالک میں تمام ذرائع کا بہاؤ (Flow) ۹۲۷ بلین ڈالرز کی مالیت تھا، یہ رقم OECD کی سرکاری ترقیاتی تمویل (Official Development Finance) برآمدی قرضے اور ذاتی ذرائع (Flows) پر مشتمل تھا، بالفاظِ دیگر تمام عطیات ذاتی عطیات، تجارتی قرضے بمعہ ذاتی بلاواسطہ سرمایہ کاری اور بینکاری قرضوں کے ذریعے دو طرفہ یا کثیرالاطراف سرکاری امدادیں اس میں شامل تھیں، ان میں سے اکثر امدادیں عطیات کی شکل کے بجائے نئے قرضوں کی شکل میں تھیں، جن پر مستقبل میں نفع یا

(1) Susan George: The Debt Boomerang How the Third World Debt Harms us all, Pluto Press, London 1992.

سود عادۃً واجب الادا ہوتا تھا۔

۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۰ء کے زمانے کے دوران ترقی پذیر ممالک نے صرف قرضوں کی ادائیگی میں قرض دینے والے ممالک کو (سود بمعہ اصل سرمایہ کے) ۳۴۲ بلین ادا کیئے، آمدِ ذرائع کی صحیح تصویر کشی کے لئے کچھ دُوسرے جنوب سے شمال تک کے اخراجات بھی شامل کرنے ہوں گے، مثلاً رائیلٹی، نفع، اپنے وطن میں نفع کی منتقلی اور خام مال کے رواں اخراجات وغیرہ۔ ۹۲۷ بلین آمدنی کے مقابلے میں ۱۳۴۵ بلین ڈالرز کی جو ادائیگی مقروض ملکوں کو کرنی پڑی اس کا مطلب یہ ہے کہ ۴۱۷ بلین ڈالرز کا باہمی فرق سراسر مالدار ممالک کے حق میں رہا۔ موازنے کے مقصد سے یہ ذہن میں رکھئے کہ امریکی مارشل پلان نے صرف ۱۴ بلین ڈالرز ۱۹۴۸ء میں اور ۷۰ بلین ڈالرز ۱۹۹۱ء میں یوروپین جنگ زدہ اقوام کو منتقل کیئے تھے، قرضوں اور ادائیگی کے مذکورہ بالا فرق کا موازنہ مارشل پلان سے کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۰ء تک غریب ممالک نے مال داروں کو چھ مارشل پلان صرف اپنے قرضوں کے سود کی ادائیگی کے طور پر ادا کیئے۔ کیا ان غیر معمولی اخراجات نے کم از کم قرضوں کے یقینی بوجھ کو کم کرنے کی خدمت انجام دی ہے؟ بدقسمتی سے یہ بات نہیں ہے، ۱.۳ ٹریلین ڈالرز سے زائد کی اصل قرضوں سمیت سود کی ادائیگی کے باوجود مقروض ممالک نے ۱۹۹۰ء میں ۱۹۸۳ء کے قرضوں کے مقابلے میں ۶۱ فیصد زائد قرضے حاصل کیئے، افریقا کے چھوٹے صحرائی علاقوں میں قرضے

اس دوران ۱۱۳ فیصد تک بڑھے، قرضوں کا بوجھ سب سے کم ترقی یافتہ ممالک میں صحیح ترین اعداد و شمار کے مطابق ۱۱۰ فیصد تک گیا۔

بہت سے معتدل مصنفین کا خیال ہے کہ تیسری دُنیا کا قرضہ صرف تمویلی معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک سیاسی معاملہ بھی ہے، عموماً ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے قرضوں کے ساتھ بڑی سخت شرائط بھی منسلک ہوتی ہیں، اگرچہ معاشی و سماجی اخراجات کے مقصد کے لئے امدادی پروگرام اس بات کی توثیق کرتا ہے کہ یہ فنڈ ترقیاتی اُمور میں استعمال ہوگا، تاہم جب وہ منصوبے ناکام ہوجاتے ہیں اور قرضے بڑھ جاتے ہیں، تو وہ امدادی پروگرام اسٹرکچل ایڈجسٹمنٹ کے تابع بن جاتے ہیں جس کا کام مقروض ممالک کی پوری معیشت کی ترقی کی نگرانی کرنا ہوتا ہے، گویا کہ قرض دینے والے ممالک اس طرح تیسری دُنیا کے ممالک کے اندرونی معاملات اور پالیسیوں میں دخل اندازی کا جواز پیدا کرلیتے ہیں، اور پھر جب (ان کی زیر نگرانی) معاشی پالیسیاں بھی ناکام ہوجاتی ہیں تو پھر وہ ''سادگی پروگرام'' (Austerity Programs) متعارف کراتے ہیں، جس میں سماجی، بہبودی اور تعلیمی اخراجات کو کافی حد تک ختم کردیا جاتا ہے، سون جورج اور فیبر یز یوسبیلی نے ان پالیسیوں کے نتائج پر درج ذیل تبصرہ کیا ہے:-

Between 1980 and 1989 some thirty-three African countries received 241 structural adjustment loans. During that same period, average GDP per capita in those countries fell 1.1% per year, while per capita food production also experienced steady decline. The real value of the minimum wage dropped by over 25%, government expenditure on education fell from $ 11 billion to $ 7 billion and primary school enrolments dropped from

80% in 1980 to 69% in 1990. The number of poor people in these countries rose from 184 million in 1985 to 216 million in 1990, an increase of seventeen percent. [1]

ترجمہ:- ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۹ء کے درمیان بعض ۳۳ افریقی ممالک نے ۲۴۱ اسٹرکچل ایڈجسٹمنٹ قرضے لئے، اسی زمانے میں فی شخص (Per Capita) متوسط خام مجموعی پیداوار (GDP) گرکر ۱ء۱ فیصد سالانہ ہوگئی، جبکہ فی شخص غذائی پیداوار بھی مسلسل کم ہوتی رہی۔ کم از کم اُجرتوں کی مقدار ۲۵ فیصد سے بھی زیادہ گرگئی، تعلیم پر حکومتی اخراجات کم ہوکر ۱۱ بلین ڈالرز سے کم ہوکر ۷ بلین ڈالرز رہ گئے، اور پرائمری اسکول کے داخلے ۱۹۸۰ء میں ۸۰ فیصد سے گرکر ۱۹۹۰ء میں ۶۹ فیصد تک ہوگئے، غریب عوام کی تعداد ان ممالک میں ۱۹۸۵ء میں ۱۸۴ ملین تھی جو ۱۹۹۰ء میں ۲۱۶ ملین ہوکر ۱۷ فیصد بڑھ گئی۔

۲۳۴:- عالمی بینک کے خود اعداد و شمار کے مطابق جن کے بارے میں بعض سنجیدہ معیشت دان شبہ میں ہیں، عالمی بینک کی تمویل کردہ منصوبوں میں کامیابی کی شرح ۵۰ فیصد سے بھی کم ہے، مزید براں ۱۹۸۹ء کے جائزے کے بعد عالمی بینک کا اسٹاف کسی ایک ایسے منصوبے کی بھی نشاندہی نہ کرسکا جس میں برطرف کئے ہوئے لوگوں کو کسی اور جگہ بحال کردیا گیا ہو، اور وہ ایسے معیارِ زندگی پر واپس آگئے ہوں جو انہیں پہلے حاصل تھا۔ [2]

(1) Susan George, Fabrizio Sablli: Faith And Credit, The World Bank's Secular Empire, Penguin 1998, P 141.

(2) David Korten: When Corporations Role the Earth, Earthscan 1993 as quoted by Michael Robwtham "The Grip Of Death", P 135.

۲۳۵:- یہاں تک کہ کامیاب منصوبے بھی بہت کم ہی ان مقروض ممالک میں مجموعی معاشی خوشحالی کا سبب بنے ہیں، مائیکل روبوتھم کہتے ہیں:-

There has been a massive outpouring of literature on the subject of Third World debt. The books are characterized by one feature. Whereas the arguments and policies of the IMF and World Bank have been based upon an apparently reasonable theory, the studies give case after case and country after country, in which the theory has not worked in practice. Either loans have led to development, but repayment has proved impossible; or the projects funded have failed completely leaving the country with a massive debt and no hope of repayment, or repeated additional loans have become necessary simply to provide funds for the repayment of past loans. The debtor countries, as a group, began the 1990s fully 61% deeper in debt than they were in 1980.(1)

ترجمہ:- تیسری دُنیا کے قرضوں کے موضوع پر بہت بڑی مقدار میں لٹریچر شائع کیا جارہا ہے، کتابیں اسی موضوع کو زیرِ بحث لائے ہوئے ہیں، جبکہ آئی ایم ایف اور عالمی بینک کی طرف سے دلائل اور پالیسیوں میں یہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ یہ دونوں معقول نظریات پر عمل پیرا ہیں، اس کے برخلاف مسلسل واقعات اور ممالک کے حالات پر تحقیق کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معقول نظریات پر عمل نہیں کیا جارہا، یا تو قرضے ترقی کا سبب تو بنے لیکن ادائیگی قرض ناممکن ہوگئی، یا فنڈ دیئے ہوئے منصوبے

(1) Michael Rowbotham: "The Grip Of Death". P. 137.

بھی مکمل طور سے اس طرح ناکام ہو گئے کہ ملک ایک عظیم قرضے
کے جال میں پھنس گیا کہ اُس سے خلاصی اور قرضوں کی ادائیگی
کا کوئی راستہ برقرار نہیں رہا، یا پھر اضافی قرضوں کے عمل کا اعادہ
ضروری سمجھا گیا تاکہ سابقہ قرضوں کی ادائیگی کے لئے فنڈ مہیا
ہو، مقروض ممالک مجموعی طور پر ۱۹۸۰ء کے مقابلے میں ۱۹۹۰ء
میں ۶۱ فیصد مزید قرضوں میں ڈوب گئے۔

تیسری دُنیا کے قرض کے مقابلے بے زمین غلاموں اور بے گار مزدوروں
سے کرکے بہت زیادہ تنقید کی گئی ہے، چیرل پیئر اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ:-

> The system can be compared point by point with peonage on an-individual scale. In the peonage, or debt slavery system ... the aim of the employer / creditor / merchant is neither to collect the debt once and for all, nor to starve the employee to death, but rather to keep the laborer permanently indentured through his debt to the employer .... Precisely the same system operates on the international level ... Is debt slavery on an international scale. If they remain within the system, the debtor countries are doomed to perpetual underdevelopment or rather, to development of their exports at the service of multinational enterprises, at the expense of development for the needs of their own citizens.[1]

ترجمہ:- اس نظام کو انفرادی سطح پر بے گار مزدوری کے ساتھ نکتہ
وار موازنہ کیا جاسکتا ہے، بے گار یا قرض کی غلامی کے نظام میں

(1) Cheryl Payer: The Debt Trap: Monthly Review Press 1974 as quoted by Rowbotham, op cit. P. 137.

قرض خواہ مالک کا مقصد ایک مرتبہ پورا قرضہ وصول کرنا نہیں ہوتا، نہ ہی ملازم یا غلام کو مرنے پر مجبور کرتے ہیں، بلکہ اس کے بجائے اس کو ہمیشہ کے لئے بے گار مزدور بنادیتے ہیں ..... خلاصہ یہ کہ یہی نظام بین الاقوامی سطح پر بھی چل رہا ہے ..... یہ بین الاقوامی سطح پر قرض کی غلامی ہے، اگر یہ نظام کے اندر ہیں تو مقروض ممالک ہمیشہ پس ماندہ یا پھر وہ اپنے شہریوں کی ضروریات کی قیمت پر بین الاقوامی تجارتوں کے ذریعے اپنے برآمدکنندگان کی ترقی کا باعث بنتے ہیں۔

۲۳۶:- ۱۹۸۷ء میں انسٹی ٹیوٹ فور افریقن آلٹرنیٹو کی کانفرنس نے عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے خاتمے اور بریٹن ووڈس انٹرنیشنل مالیاتی نظام کے مکمل خاتمے کا مطالبہ کیا، کانفرنس نے یہ بھی ملاحظہ کیا کہ واقعاتی تجزیوں (Case Study) کے نتائج حسبِ ذیل تھے:-

> In virtually all cases, the impact of these (IMF and World Bank) projects has been basically negative. They have resulted in massive unemployment, falling real incomes, pernicious inflation, increased imports with persistent trade deficits, net outflow of capital, mounting external debts, denial of basic needs, severe hardship and deindustrialization. Even the so-called success stories in Ghana and the Ivory Coast have turned out to offer no more than temporary relief which had collapsed by the mid 1980s. The sectors that have the social services, while agriculture, manufacturing and the social services, while the burden of adjustment has fallen regressively on the poor

and weak social groups.[1]

ترجمہ:- تقریباً تمام معاملات میں ان (آئی ایم ایف اور عالمی بینک) کے منصوبوں کے اثرات بنیادی طور پر منفی تھے، وہ بہت بڑے پیمانے پر بے روزگاری، حقیقی آمدنی کا زوال، نقصان دہ افراطِ زر، مستقل تجارتی خسارے کے ساتھ درآمدات میں اضافہ، سرمایہ کا اضافی خرچ، بیرونی قرضوں کا عروج، بنیادی ضروریات کا انکار، سخت مشکلات اور غیر صنعت کاریوں پر منتج ہوتے تھے، یہاں کہ گھانا اور ایوری کوسٹ کی نام نہاد کامیابیوں کی کہانیوں نے صرف عارضی طور پر اطمینان کا سانس لیا، جس کے بعد ۱۹۸۰ء کے عشرے کے وسط میں زوال کا شکار ہوگئے، وہ سیکٹر جو بہت بُری طرح متأثر ہوئے وہ زراعت، صنعت اور سماجی خدمات ہیں، جبکہ تصفیے کا بوجھ بہت بُری طرح غرباء اور کمزور سماجی گروہوں پر پڑا۔

۲۳۷:- یہ حقائق اس بات کا احساس دلانے کے لئے کافی ہیں کہ یہ مفروضہ کس قدر غلط ہے کہ تیسری دُنیا کے ممالک غیرملکی قرضوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کس نے اس نظام سے حقیقۃً فائدہ اُٹھایا؟ اس سوال کو حال ہی میں ایک کینیڈین اسکالر جیلناس نے اپنی کتاب "Freedom From Debt" میں لکھا ہے، وہ کہتے ہیں:-

> The foreign-aid-based development model has proved itself powerless to bring a single country out of economic and financial dependence. However, it has turned out to be a source of fabulous wealth for certain Third

(1) Bad Onimode: The IMF, The World Bank and African Debt. Zed Books, 1989, as quoted by Rowbotham, op. cit. P. 136.

World elites, giving birth to a new form of power and a socio-political class that can rightly be called the aidocracy.[1]

ترجمہ:- غیر ملکی قرضوں کے ذریعے ترقی کا نمونہ کسی ایک ملک کو بھی اقتصادی یا تمویلی انحصار سے باہر نکالنے پر قادر نہ ہوسکا، تاہم یہ تیسری دُنیا کے مال داروں کے لئے عظیم دولت کے حصول کا سبب ضرور بنا ہے، جس کی وجہ سے ایک نئی قسم کی طاقت اور سماجی معاشی کلاس وجود میں آئی ہے، جس کو ایڈوکریسی کہنا حق بجانب ہوگا۔

پاکستان کا معاملہ بہت زیادہ مختلف نہیں ہے، ایک ایسے وقت جب ہم اپنی معیشت کو ترقی دینے، اپنی عوام کی حالت سدھارنے، غربت دُور کرنے، تعلیم کی شرح بڑھانے اور دیہاتوں میں کم از کم بنیادی صحت فراہم کرنے کے شدید محتاج ہیں، اور جب ہمارے ملک میں ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے طبی امداد کے انتظار میں موت کے کنارے پہنچے ہوئے ہیں، ہم اس پر مجبور ہیں کہ ہم اپنے ٹوٹل بجٹ کا ۴۶ فیصد سودی قرضوں کی ادائیگی پر لگادیں، اس کے باوجود ہم اور قرضے لے رہے ہیں تاکہ سابقہ قرضوں کو ادا کردیا جائے، جب ان نئے قرضوں کی معیاد پوری ہوگی، تو ہم مزید قرضے لینے پر مجبور ہوں گے تاکہ موجودہ قرضوں کو اُتارا جاسکے، ہم کب تک اس مصیبت کے گرد چکر کاٹتے رہیں گے؟ ہم قرض در قرض کے چکر میں کب تک گھومتے رہیں گے؟ ہمیں اس قرض پر مبنی معیشت سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا، جس نے ہم سے آزادی غصب کرلی ہے، اور ہماری اگلی نسلوں کو قرض خواہوں کے ہاتھوں میں گروی رکھوادیا ہے، یہ ہماری قوم کی زندگی اور موت کا سوال ہے، اور ہمیں اسے ہر قیمت پر حل کرنا ہوگا۔

(1) Jaques B. Gelinas, Freedom from Debt, Zed Books, London and New York, 1998, P. 59.

۲۳۸:- ہم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ ایک مرتبہ ہم جب موجودہ قرضوں کی تہہ میں پھنس گئے ہیں تو اس سے ایک ہی رات میں نکلنا ناممکن ہے، اسے نافذ کرنے کے لئے ایک بہترین سوچے سمجھے پروگرام اور ایک مضبوط قوتِ ارادی کی ضرورت ہوگی، درمیانے عرصے میں جس میں ایک ماہرانہ منصوبے سے قرضے لازماً کم کرنے ہوں گے، ہم اس سابقہ قرضوں میں برقرار رہیں گے، لیکن اس عبوری دور میں بھی ہم کو اپنے قرض خواہوں کے ساتھ ازسرِنو طریقۂ تمویل پر غور کرنا ہوگا، تاکہ سودی قرضوں کو اسلامی طریقۂ تمویل میں تبدیل کیا جاسکے۔

اسلامی بینکوں کی پیدا کردہ فضا کے نتیجے میں ان اسلامی طریقۂ تمویل سے مغرب اب ناواقف نہیں رہا، یہاں تک کہ بین الاقوامی تمویلی ادارے بھی انہیں سمجھنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ آئی ایف سی جو کہ عالمی بینک کی ذاتی تمویلی شاخ ہے، اس نے پہلے ہی اسلامی طریقہ ہائے تمویل استعمال کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے، اثاثوں سے وابستہ قرضے آسانی کے ساتھ اجارہ کے طریقۂ تمویل میں تبدیل کئے جاسکتے ہیں، پروجیکٹ سے وابستہ قرضے آسانی سے استصناع کی بنیاد پر تبدیل کئے جاسکتے ہیں، قرضہ دینے والوں کی توجہ صرف اپنی تمویل کے اُوپر نفع کی طرف ہوتی ہے، وہ کسی مخصوص طریقۂ تمویل پر اصرار نہیں کرتے، اس لئے موجودہ قرضوں کو اسلامی خطوط پر منتقل کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہونی چاہئے، نئی تمویلات کے لئے اور بھی زیادہ متنوع قسم کے طریقہ ہائے تمویل موجود ہیں، جنہیں اسلامی خطوط پر تبدیل کیا جاسکتا ہے، تاہم یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے کہ جب حکومت خود اسلامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا عزم رکھتی ہو، معذرت خواہانہ انداز کبھی بھی دُوسروں کو اتنے پرانے عرصے سے زیرِ استعمال طریقوں کو تبدیل کرنے پر راضی نہیں کرسکتا۔ آئی ایف سی (انٹرنیشنل فائنانس کارپوریشن جو عالمی مالیاتی ادارے سے ملحق ہے) کے صدر ہالہ اسپنگ ملز کی مجوزہ سرمایہ کاری پر بورڈ آف ڈائریکٹرز کو پیش کردہ رپورٹ پوری قوم

کے لئے شرمندگی کا باعث ہے، ان کا تبصرہ درج ذیل ہے:-

A change to Islamic modes of financing has been considered by IFC, but this would be contrary to the government (of Pakistan's) intention for foreign loans.

Adoption by a foreign lender of Islamic instruments could be construed as undermining Government's policy to exempt foreign lenders from this requirement.[1]

ترجمہ:- آئی ایف سی اسلامی طریقہ ہائے تمویل اختیار کرنے پر غور کر چکی ہے، لیکن یہ حکومتِ پاکستان کے ارادے کے مخالف نظر آتا ہے۔

کسی غیر ملکی قرض دہندہ کے اسلامی طریقہ اختیار کرنے کو یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ حکومت کی اس پالیسی کی درپردہ مخاصمت ہوگی کہ وہ غیر ملکی قرض دہندوں کو اس سے مستثنیٰ کرنا چاہتی ہے۔

۲۳۹:- ۱۷ نومبر ۱۹۹۰ء کو وزیراعظم پاکستان نے ایک کمیٹی تشکیل دی، جس کا مقصد ملک میں بیرونی انحصار کے اضافے کا جائزہ لینا اور خودانحصاری کو ترقی دینے کے منصوبے کی تیاری تھا، وہ کمیٹی اس وقت کے سینیٹر پروفیسر خورشید احمد صاحب کی سربراہی میں قائم کی گئی تھی، اور فائنانس ڈویژن کے سکریٹری اور اکنامک ڈویژن کے چیف اکانومسٹ اور بعض دوسرے ماہرین پر مشتمل تھی، اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ اپریل ۱۹۹۱ء میں حکومت کو پیش کی، اس کمیٹی نے خوب غور و خوض کے بعد صرف اقتصادی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خودانحصاری کا مقصد صرف سود کے خاتمے میں ہی منحصر ہے، اس کمیٹی کی تجاویز غیر ملکی قرضوں سے نمٹنے کے لئے بھی استعمال کی جاسکتی ہیں۔

(1) No IFC / P - 887, dated December 22, 1987, as quoted by the Report of Prime Minister's Committee on self reliance, headed by Prof. Khurshid Ahmad, Islamabad, 1991.

۲۴۰:- اسی لئے مسئلہ مشکلات کو غیر ملکی ذمہ داریوں کو حل کرنے کے سلسلے میں ممانعتِ رِبا کے لئے ایک غیر معینہ مدت تک کے لئے عذر قرار نہیں دیا جاسکتا، تاہم اس بات سے بالکل انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کو ملکی قرضوں کے معاملے میں زیادہ مدت درکار ہوگی، نظریہ ضرورت کا بھی صرف اسی حد تک اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

نتیجہ بحث

۲۴۱:- مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے:-

۲۴۲:- قرآنِ پاک کی متعدد آیات کی رُو سے کہ کسی بھی قرض کے معاہدے میں اصل سرمایہ کے اُوپر لی جانے والی رقم رِبا میں داخل ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درج ذیل صورتوں کو بھی رِبا قرار دیا ہے:-

(۱) ایک کرنسی کا اُسی کرنسی کے ساتھ تبادلہ، جب دونوں طرف کی کرنسیاں برابر نہ ہوں، خواہ معاملہ نقد ہو یا اُدھار۔

(۲) ایک ہی قسم کی کوئی بھی وزنی یا پیمائش کے قابل اشیاء کا تبادلہ جبکہ دونوں طرف کی مقدار برابر نہ ہو، یا ان میں سے کسی ایک طرف کی ڈیلیوری اُدھار ہو۔

(۳) دو مختلف الجنس وزنی یا پیمائش کے قابل اشیاء کا بارٹر جبکہ ان میں سے ایک طرف کی ڈیلیوری مؤجل (اُدھار) ہو۔

۲۴۳:- اسلامی فقہ میں یہ تین صورتیں رِبا السنۃ کہلاتی ہیں، کیونکہ ان کی حرمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت ہے، رِبا القرآن کے بشمول عقد کی یہ چاروں اقسام قرآن وسنت کی بنیاد پر اسلامی فقہ میں رِبا کہلاتی ہیں۔

۲۴۴:- مندرجہ بالا میں سے آخری دو یعنی نمبر۲ اور ۳ موجودہ تجارت سے بہت زیادہ تعلق نہیں رکھتیں، کیونکہ بارٹر کی تجارت جدید تجارت میں بہت شاذ اور نادر الاستعمال ہیں، تاہم رِبا القرآن اور زَر کی تجارت (نمبر ایک میں بیان کردہ) جدید

تجارت سے بہت زیادہ متعلق ہے۔

۲۴۵:- جہاں تک رِبا کی حرمت کا تعلق ہے، مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں قرض کی مختلف اقسام میں کوئی فرق نہیں ہے، اور اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ قرض کے معاملے میں اصل سرمایہ کے اُوپر مشروط اضافی رقم خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، اس لئے یہ قرار دیا جاتا ہے کہ انٹرسٹ کی تمام مروّجہ صورتیں خواہ بینکاری نظام کی ہوں یا پرائیویٹ معاملات کی، یقیناً ''رِبا'' کی تعریف میں داخل ہیں۔ اسی طرح حکومتی قرضے خواہ ملکی ہوں یا غیرملکی ''رِبا'' میں داخل ہیں، اور قرآنِ پاک کی رُو سے صراحۃً حرام ہیں۔

۲۴۶:- انٹرسٹ پر مبنی موجودہ تمویلی نظام، قرآن و سنت کے بیان کردہ اسلامی اَحکامات کے خلاف ہے، اور اس کو شریعت کے مطابق بنانے کے لئے زبردست تبدیلیاں لانی ہوں گی۔

۲۴۷:- مذہبی علماء، اقتصادی ماہرین اور بینکاروں نے مختلف قسم کے اسلامی طریقہ ہائے تمویل مرتب کئے ہیں، جو کہ سود کے بہتر متبادل بن سکتے ہیں، یہ طریقہ ہائے تمویل دُنیا کے مختلف حصوں میں تقریباً دو سو اسلامی تمویلی ادارے استعمال کر رہے ہیں۔

۲۴۸:- ان طریقہ ہائے تمویل کی موجودگی میں سود کے معاملات کو نظریۂ ضرورت کی بنیاد پر اجازت نہیں دی جاسکتی۔ بہت سارے بینکرز بیرونِ ممالک سے بشمول ڈاکٹر احمد محمد علی (صدر اسلامی ترقیاتی بینک، جدہ)، شیخ عدنان البحر (چیف ایگزیکٹو انٹرنیشنل انویسٹر، کویت)، اقبال احمد خان (ہانگ کانگ شنگھائی بینک کارپوریشن کے اسلامی ادارے کے سربراہ)، جبکہ اندرونِ ملک سے عبدالجبار خان (سابق صدر نیشنل بینک آف پاکستان)، محترم شاہد حسن صدیقی اور محترم مقبول احمد خان عدالت کی معاونت کے لئے تشریف لائے، یہ حضرات دُنیا کے مختلف حصوں میں

بینکاری کا طویل تجربہ رکھتے ہیں، اور ان کے علاوہ دُوسرے ماہرین حضرات بھی عدالت کی معاونت کے لئے عدالت میں تشریف لائے، ان میں سے سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ اسلامی طریقہ ہائے تمویل نہ صرف ممکن ہیں، بلکہ ایک معتدل اور مضبوط معاشی نظام کے قیام کے سلسلے میں انتہائی مفید بھی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے حقائق اور اعداد و شمار کے ذریعے بہت سے دلائل اور ثبوت بھی مہیا کئے، بعض مشہور اقتصادی ماہرین مثلاً ڈاکٹر عمر چھاپرا (اقتصادی مشیر برائے سعودی مالیاتی ادارے)، ڈاکٹر ارشد زماں (سابق چیف اکانومسٹ حکومتِ پاکستان)، پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر نواب حیدر نقوی، ڈاکٹر وقار مسعود خان نے اپنے تفصیلی بیانات کے ذریعے اس نقطۂ نظر کی حمایت کی۔

۲۴۹:- ہم نے اسلامی نظریاتی کونسل کی ۱۹۸۰ء کی تفصیلی رپورٹ اور کمیشن فور اسلامائزیشن آف اکانومی کی ۱۹۹۱ء کی رپورٹ اور پھر اسی کمیشن کے ۱۹۹۷ء میں دوبارہ قیام کی رپورٹ جو اگست ۱۹۹۷ء میں پیش کی گئی تھی کا گہرائی اور تفصیل سے جائزہ لیا۔ ہم نے وزیرِاعظم کے قائم کردہ کمیشن برائے خود انحصاری کی رپورٹ جو اپریل ۱۹۹۱ء میں داخلِ دفتر کی گئی تھی، کا مطالعہ بھی کیا۔

۲۵۰:- لہٰذا اب یہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ایک واضح دلیل اور ثبوت ہے کہ موجودہ عصری تمویلی نظام کو اسلامی نظام میں ڈھالنے کے سلسلے میں کافی ٹھوس کام کیا جاچکا ہے، لہٰذا موجودہ سودی نظام کو نظریۂ ضرورت کی بنیاد پر ایک غیر محدود مدّت کے لئے مزید جاری نہیں رکھا جاسکتا، تاہم اس نظام کی تبدیلی اور انتقال کے لئے اس نظریۂ ضرورت کی بنیاد پر کچھ وقت دیا جاسکتا ہے۔

۲۵۱:- مندرجہ بالا وجوہات کی بنیاد پر یہاں پر کورٹ آرڈر میں موجود تفصیل کی بنیاد پر تمام اپیلیں خارج کی جاتی ہیں۔

کورٹ آرڈر

شریعہ اپیل نمبر 1/92

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ،
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحۡبِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ

ان تفصیلی وجوہات کی بنا پر جنہیں جسٹس خلیل الرحمٰن خان، جسٹس وجیہ الدین احمد اور جسٹس محمد تقی عثمانی نے اپنے علیحدہ علیحدہ تین فیصلوں میں تحریر کیا ہے، کوئی بھی رقم جو چھوٹی ہو یا بڑی، اگر قرضے کے معاہدے میں اصل رقم پر لی گئی ہے تو وہ ربا ہے، جسے قرآن نے منع کیا ہے، چاہے یہ قرضہ استعمال کرنے کے لئے لیا گیا ہو یا کسی پیداواری عمل کے لئے ہو، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل سودوں کو بھی ربا کہا ہے:-

(I) ایسا سودا جس میں رقم کے بدلے رقم دی جاتی ہو، جو ایک ہی مالیت کی کرنسی ہو مگر اس کی تعداد ایک جیسی نہ ہو، چاہے یہ سودا نقد ہو یا اُدھار۔

(II) چیز کے بدلے چیز کا ایسا سودا جس میں وہ چیزیں تولنے یا ناپنے کے لائق تو ہوں مگر دونوں طرف سے اس کی مقدار برابر نہ ہو، اور کسی ایک فریق کی طرف سے یہ چیز بعد میں دی جانی ہو۔

(III) تولنے یا ناپنے کے لائق دو مختلف چیزوں کے درمیان چیز کے بدلے چیز کا ایسا سودا جس میں ایک طرف سے چیز بعد میں دی جانی ہو۔

اسلامی فقہ میں یہ تینوں قسمیں ربا السنہ کہلاتی ہیں، کیونکہ ان کی ممانعت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت ہے۔ ربا القرآن کے ساتھ مل کر چار قسم کے سودے قرآن اور سنت کی بنیاد پر قائم اسلامی فقہ میں ربا کہلاتے ہیں، ان چار قسموں میں سے دو قسمیں (II) اور (III) جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے، موجودہ تجارت کے زُمرے میں نہیں آتے، کیونکہ آج کل اشیاء کے بدلے اشیاء کی تجارت شاذ و نادر

ہی ہوتی ہے، البتہ رِبا القرآن اور رقم کا سودا جس کا اُوپر (I) میں ذکر کیا گیا ہے، موجودہ تجارت سے زیادہ متعلق ہیں۔

متذکرہ بالا تفصیلی بحث کی روشنی میں، جہاں تک رِبا کی ممانعت کا سوال ہے، قرضے کی قسموں میں کوئی فرق نہیں ہے، اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ قرضے کی اصل رقم کے اُوپر جو اضافی رقم ادا کرنی ہے وہ چھوٹی ہے یا بڑی ہے، اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ سود کی موجودہ تمام شکلیں چاہے وہ بینک کے کاروبار میں ہوں یا نجی کاروبار میں، رِبا کی تعریف میں آتی ہیں۔ اسی طرح حکومت کے تمام قرضے چاہے وہ ملک کے اندر سے حاصل کئے گئے ہوں یا ملک کے باہر سے، رِبا ہیں، جس کی قرآنِ پاک نے واضح طور پر ممانعت کی ہے۔

موجودہ مالیاتی نظام جس کا انحصار سود پر، قرآن اور سنت میں دیئے گئے اسلامی اَحکام کے خلاف ہے اور اسے شریعت کے مطابق بنانے کے لئے اس میں انقلابی تبدیلیاں کرنا ہوں گی۔

مسلم علماء، ماہرینِ معاشیات اور بینکاروں نے مالیات کے اسلامی طریقوں کو فروغ دیا ہے، جو سود سے بہتر متبادل طریقوں کا کام کرسکتے ہیں، یہ طریقے دُنیا کے 200 مالیاتی اداروں میں استعمال کئے جارہے ہیں۔

ان متبادل طریقوں کی موجودگی میں سود کو، ضرورت کو بنیاد بنا کر ہمیشہ کے لئے جاری نہیں رکھا جاسکتا، بہت سے تجربہ کار بینکار جیسے جدہ کے اسلامک ڈویلپمنٹ بینک کے صدر ڈاکٹر احمد محمد علی، کویت کے انٹرنیشنل انویسٹر کے چیف ایگزیکٹو عدنان البحر، ہانگ کانگ شنگھائی بینکنگ کارپوریشن جو پاکستان سے باہر لندن میں قائم ہے، اس کے اسلامک یونٹ کے چیف ایگزیکٹو اقبال احمد خان، نیشنل بینک پاکستان کے سابق صدر عبدالجبار خان اور پاکستان کے شاہد حسن صدیقی اور مقبول احمد خان ایسے بینکرز ہیں جنہیں دُنیا کے مختلف علاقوں میں بینکنگ کا طویل تجربہ ہے، یہ لوگ ہمارے

سامنے پیش ہوئے، یہ تمام حضرات اس بات پر متفق تھے کہ مالیات کے اسلامی طریقے نہ صرف یہ کہ ممکن ہیں، بلکہ ایک متوازن اور مستحکم معیشت کے لئے زیادہ فائدہ مند بھی ہیں، اپنے اس خیال کی حمایت میں انہوں نے اعداد و شمار پر مبنی مواد بھی مہیا کیا، چند ممتاز ماہرینِ معاشیات جیسے سعودی مونیٹری ایجنسی کے اکنامک ایڈوائزر ڈاکٹر عمر چھاپرا، حکومتِ پاکستان کی وزارتِ خزانہ کے چیف ایگزیکٹو پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر نواب نقوی اور ڈاکٹر وقار مسعود خان نے اس خیال کی حمایت کی۔

ہم نے اسلامی نظریاتی کونسل کی تفصیلی رپورٹ کا جو 1980ء میں پیش کی گئی تھی، کمیشن فار اسلامائزیشن آف اکانومی کی رپورٹ کا جو 1991ء میں تشکیل دیا گیا تھا اور اسی کمیشن کی فائنل رپورٹ کا جو 1997ء میں دوبارہ تشکیل دیا گیا اور جس کی رپورٹ اگست 1997ء میں پیش کی گئی، مطالعہ کیا ہے۔ ہم نے وزیراعظم کی کمیٹی آف سیلف ریلائنس کی رپورٹ کا بھی مطالعہ کیا ہے، جو کہ حکومت کو اپریل 1991ء میں پیش کی گئی تھی۔

اس طرح یہ ثابت کرنے کے لئے کافی شہادت ہے کہ موجودہ مالیاتی نظام کو اسلامی نظام میں بدلنے کی تدبیر کے لئے اہم گراؤنڈ ورک کرلیا گیا ہے، اور سود پر مبنی موجودہ نظام کو ضرورت کی بنیاد پر غیر معینہ عرصے کے لئے قائم نہ رکھا جائے۔ اب ہم قوانین کی ان دفعات کا جائزہ لیتے ہیں جو اس فیصلے کی وجوہات کے بارے میں ہیں۔

I: انٹرسٹ ایکٹ 1839

یہ قانون عدالت کو اختیار دیتا ہے کہ وہ قرضہ دینے والے کو تمام قرضوں پر یا اس رقم پر جو عدالت ادا کرواتی ہے سود وصول کرنے کی اجازت دے۔ وفاقی شرعی عدالت نے اس قانون کو اسلامی اَحکام سے متصادم قرار دیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اپنے سیشن منعقدہ 11 نومبر 1981ء میں اس قانون کو ختم کرنے کی سفارش کی تھی۔

عدالت کی طرف سے ڈگری منظور کرتے ہوئے سود وصول کرنے کی اجازت دینے کے مسئلے پر نگوشی ایبل انسٹرومنٹس ایکٹ 1881 اور سول پروسیجر کوڈ 1908 اور ان میں وقتاً فوقتاً کی گئی ترمیمات میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اس لئے انٹرسٹ ایکٹ 1839ء کو قائم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے اور اسے ختم کرنے کے لئے یہ وجہ کافی ہے، کسی قرضے پر سود وصول کرنے کی اجازت دینے کا غیر معینہ، بے روک ٹوک اور عام اختیار، متذکرہ بالا وجوہات کی بنا پر اسلامی اَحکام کے خلاف ہے۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ انٹرسٹ ایکٹ 1839ء اسلامی اَحکام سے متصادم ہونے کی وجہ سے صحیح طور پر ختم کر دیا گیا۔

II: گورنمنٹ سیونگز بینک ایکٹ 1873

اس ایکٹ کے تحت کسی کو نامزد کرنا ہوتا ہے اور جمع شدہ رقم کی ادائیگی رقم جمع کرنے والے کی موت کے بعد کی جاتی ہے اور اس وقت مکمل رقم ادا کر دی جاتی ہے۔ اس سیونگز میں قرض دینے والوں اور ایگزیکٹوشیئرز کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔

سیکشن 10 جسے چیلنج کیا گیا ہے، مندرجہ ذیل ہے:-

''اگر کوئی رقم کسی نابالغ نے جمع کی ہے یا اس کی طرف سے جمع کرائی گئی تو اگر اس نے خود جمع کی ہے تو اسے ذاتی طور پر ادا کر دی جائے گی، لیکن اگر اس کے علاوہ کسی اور نے جمع کی ہے تو اس کے استعمال کے لئے اس کے گارجین کو ادا کی جائے گی اور اس کے ساتھ اس پر واجب ہو جانے والا سود بھی ادا کیا جائے گا۔''

اس دفعہ کو لفظ سود کی وجہ سے جو جمع کی ہوئی رقم کے ساتھ ہی ادا کی جائے گا، اسلامی اَحکام سے متصادم قرار دیا گیا ہے۔ وفاقی شریعت عدالت کے لائق ججوں نے اس رقم کی نوعیت کا جائزہ نہیں لیا جو کہ جمع شدہ رقم پر واجب ہوگی۔ اگر یہ رقم سرمایہ کاری کے جائز طریقوں سے حاصل ہوئی ہے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا

جاسکتا، اصل زور مالیات کے اسلامی طریقے اختیار کرنے اور اسلامی اُصولوں کے مطابق تجارت کو چلانے پر دیا جانا چاہئے۔ اس لئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ سیکشن 10 میں استعمال ہونے والا سود کا لفظ اسلامی احکام کے خلاف ہے اور اس کے بجائے اسے شرعی معاوضہ کرلیا جائے۔

III: نگوشی ایبل انسٹرومنٹس ایکٹ 1881

نگوشی ایبل انسٹرومنٹس ایکٹ 1881 کی مختلف دفعات کے بارے میں بحث فیصلے کے پیراگراف 242 سے 278 تک میں شامل ہے، اس ایکٹ کی سیکشن 79 اور 80 میں ترمیم کے بعد مارک اَپ نظام کے تصور کو اختیار کرلیا گیا تھا، اس نظام کو بھی موجودہ شکل میں اسلامی احکام کے خلاف قرار دیا گیا ہے اور یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اس ایکٹ کی 79 اور 80 سیکشن کی دفعات سے مارک اَپ کا لفظ حذف کردیا جائے، ہم میں سے ایک جج (جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی) کی اس وقت رائج مارک اَپ سسٹم جس پر بینکوں میں عمل کیا جارہا ہے، اور اس کے اثر کے بارے میں رائے، ایک کتاب کی شکل میں چھپ چکی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ ربا (سود) کے مترادف ہے جو اسلام میں منع ہے۔ یہ رائے مندرجہ ذیل ہے:۔

"بلاسود بینکاری پر اب تک جو علمی اور تحقیقی کام سامنے آیا ہے، ان میں احقر کی معلومات کی حد تک سب سے زیادہ جامع، مفصل اور تحقیقی رپورٹ وہ ہے جو اسلامی نظریاتی کونسل نے علمائے کرام اور ماہرین معاشیات و بینکاری کی مدد سے مرتب کی ہے، اور اب منظر عام پر آچکی ہے، اس رپورٹ کا حاصل بھی یہی ہے کہ بلاسود بینکاری کی اصل بنیاد نفع و نقصان کی تقسیم پر قائم ہوگی اور بینک کا بیشتر کاروبار شرکت یا مضاربت پر مبنی ہوگا، البتہ جن کاموں میں شرکت یا مضاربت کارآمد نہیں ہوسکتی، وہاں کے لئے اس رپورٹ میں کچھ اور متبادل راستے بھی تجویز کئے گئے ہیں،

جنہیں وقت ضرورت عبوری دور میں اختیار کیا جاسکتا ہے، انہی متبادل راستوں میں ایک متبادل راستہ وہ ہے جسے اس رپورٹ میں ''بیع مؤجل'' کا نام دیا گیا ہے۔

''اس طریقۂ کار کا خلاصہ اس طرح کہئے کہ مثلاً ایک کاشت کار ٹریکٹر خریدنا چاہتا ہے، لیکن اس کے پاس رقم نہیں ہے۔ بحالات موجودہ ایسے شخص کو بینک سود پر قرض دیتا ہے، یہاں سود کے بجائے شرکت یا مضاربت اس لئے نہیں چل سکتی کہ کاشت کار ٹریکٹر تجارت کی غرض سے نہیں، بلکہ اپنے کھیت میں استعمال کرنے کے لئے خریدنا چاہتا ہے۔ ..... چنانچہ یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ بینک کاشت کار کو روپیہ دینے کے بجائے ٹریکٹر خرید کر ادھار قیمت پر دے دے اور اس کی قیمت پر اپنا کچھ منافع رکھ کر متعین کرے، اور کاشت کار کو اس بات کی مہلت دے کہ وہ بینک کو ٹریکٹر کی مقررہ قیمت کچھ عرصے کے بعد ادا کردے۔ اس طریقہ کو اسلامی کونسل کی رپورٹ میں ''بیع مؤجل'' کا نام دیا گیا ہے، اور اس میں بینک نے ٹریکٹر کی بازاری قیمت پر جو منافع رکھا ہے اسے معاشی اصطلاح میں ''مارک اپ'' کہا جاتا ہے۔

''اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم یکم جنوری 1981ء سے نافذ ہونے والی اسکیم کا جائزہ لیتے ہیں تو نقشہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ اس اسکیم میں نہ صرف یہ کہ ''مارک اَپ'' کو غیر سودی کاؤنٹرز کے کاروبار کی اصل بنیاد قرار دے دیا گیا، بلکہ ''مارک اَپ'' کے طریقۂ کار میں ان شرائط کا بھی لحاظ نظر نہیں آتا جو اس ''مارک اَپ'' کو محدود فقہی جواز عطا کرسکتی تھیں، چنانچہ اس میں مندرجہ ذیل سنگین خرابیاں نظر آتی ہیں۔''

''بیع مؤجل'' کے جواز کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ بائع جو چیز فروخت کر رہا ہے، وہ اس کے قبضے میں آچکی ہو، اسلامی شریعت کا یہ معروف اُصول ہے کہ جو چیز کسی انسان کے قبضے میں نہ آئی ہو اور جس کا کوئی خطرہ (Risk) انسان نے قبول نہ کیا ہو، اسے آگے فروخت کرکے اس پر نفع حاصل کرنا جائز نہیں، اور زیرِ نظر اسکیم میں

فروخت شدہ چیز کے بینک کے قبضے میں آنے کا کوئی تذکرہ نہیں، بلکہ یہ صراحت کی گئی ہے کہ بینک ''مارک اَپ'' اسکیم کے تحت کوئی چیز مثلاً چاول اپنے گاہک کو فراہم نہیں کرے گا، بلکہ اس کو چاول کی بازاری قیمت دے گا، جس کے ذریعے وہ بازار سے چاول خرید لے گا، اور اسکیم کے الفاظ میں ''جن اشیاء کے حصول کے لئے بینک کی طرف سے رقم فراہم کی گئی ہے، ان کے بارے میں سمجھا جائے گا کہ وہ بینک نے اپنی فراہم کردہ رقم کے معاوضے میں بازار سے خرید لی ہیں، اور پھر انہیں نوّے دن کے بعد واجب الاداء زائد قیمت پر ان اداروں کے ہاتھ فروخت کردیا ہے (جو اس سے رقم لینے آئے ہیں)۔ (اسٹیٹ بینک نیوز یکم جنوری 1981ء صفحہ:9)

اس میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ وہ اشیاء بینک کی ملکیت اور اس کے قبضے میں کب اور کس طرح آئیں گی؟ اور محض کسی شخص کو کوئی رقم دے دینے سے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ وہ چیز وہ خریدنا چاہ رہا ہے، وہ پہلے بینک نے خریدی اور پھر اس کے ہاتھ بیچ دی ہے؟ صرف کاغذ پر کوئی بات فرض کر لینے سے وہ حقیقت کیسے بن سکتی ہے جب تک اس کا صحیح طریقِ کار اختیار نہ کیا جائے؟ .... '' بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ 28 مارچ کو چاول وغیرہ کی خریداری کے لئے بینکوں نے جو رقمیں رائس کارپوریشن کو پہلے سے دی ہوئی تھیں، 28 مارچ کو یہ سمجھا جائے گا کہ کارپوریشن نے وہ رقمیں سود کے ساتھ بینک کو واپس کردی ہیں اور پھر بینک نے اسی روز وہ رقمیں دوبارہ کارپوریشن کو مارک اَپ کی بنیاد پر دے دی ہیں اور جس جنس کی خریداری کے لئے وہ قرضے دیئے گئے تھے، یہ سمجھا جائے گا کہ وہ بینک نے خرید لی ہے، اور پھر کارپوریشن کو مارک اَپ کی بنیاد پر بیچ دی ہے، اب سوال یہ ہے کہ جن رقموں سے کارپوریشن پہلے چاول وغیرہ خرید چکی ہے اور شاید خرید کر آگے فروخت بھی کرچکی ہے اس کے بارے میں کون سی منطق کی رُو سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ بینک نے خرید کر دوبارہ کارپوریشن کو بیچی ہے؟''

اس سے یہ بات واضح طور پر مترشح ہوتی ہے کہ بیع مؤجل کا طریقہ حقیقی طور پر اپنانا پیشِ نظر نہیں، بلکہ فرضی طور پر اس کا صرف نام لینا پیشِ نظر ہے، اور انتہا یہ ہے کہ اس جگہ یہ نام بھی برقرار نہیں رہ سکا، بلکہ بینک کی دی ہوئی رقم کو قرض (Advance) اور اس عمل کو قرض لینے (Lend) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(اسٹیٹ بینک نیوز کیم جنوری 1981ء صفحہ:7)

اس اسکیم کی ایک سنگین ترین غلطی اور ہے، ''بیع مؤجل'' کے لئے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ معاہدے کے وقت فروخت شدہ شے کی قیمت بھی واضح طور پر متعین ہوجائے، اور یہ بات بھی کہ یہ قیمت کتنی مدّت میں ادا کی جائے گی؟ پھر اگر خریدنے والا وہ قیمت معینہ مدّت پر ادا نہ کرے تو اس سے وصول کرنے کے لئے تمام قانونی طریقے استعمال کئے جاسکتے ہیں، لیکن ادائیگی میں تأخیر کی بنیاد پر معینہ قیمت میں اضافہ کرنے کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہے، کیونکہ تأخیر کی بنیاد پر قیمت میں اضافہ کرتے چلے جائیں تو اسی کا دُوسرا نام ''سود'' ہے، لیکن زیرِ نظر اسکیم میں اس اہم اور بنیادی شرط کی بھی یہ کہ پابندی نہیں کی گئی بلکہ بعض معاملات میں وضاحت کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی گئی ہے، چنانچہ اس میں کہا گیا کہ امپورٹ بلوں کی ادائیگی میں بینک جو رقم خرچ کرے گا اس پر ابتداءً بیس دن کی مدّت کے لئے اعشاریہ 78 فیصد مارک اَپ وصول کرے گا، اور اگر یہ رقم بیس دن میں ادا نہ ہوئی تو مزید چودہ دن کے لئے اعشاریہ 58 فیصد مارک اَپ کا مزید اضافہ ہوگا، اور اگر 34 دن گزر جانے پر بھی قیمت کی ادائیگی نہ ہوئی تو اس قیمت پر مزید اعشاریہ 62 فیصد مارک اَپ کا اضافہ ہوگا، اور اگر 48 دن گزر جانے پر بھی ادائیگی نہ ہوئی تو آئندہ ہر 15 دن کی تأخیر پر مزید اعشاریہ 79 فیصد کے مارک اَپ کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

''اندازہ فرمایئے کہ یہ طریقِ کار واضح طور پر سود کے سوا اور کیا ہے؟ اگر انٹرسٹ کے بجائے نام ''مارک اَپ'' رکھ دیا جائے اور باقی تمام خصوصیات وہی رہیں

تو اس سے ''غیر سودی نظام'' کیسے قائم ہو جائے گا؟

''واقعہ یہ ہے کہ اسلام کو جس قسم کا نظام سرمایہ کاری مطلوب ہے وہ ''مارک اَپ'' کے ''میک اَپ'' سے حاصل نہیں ہوگا، اس کے لئے محض قانونی لیپاپوتی کی نہیں، انقلابی فکر کی ضرورت ہے۔''

رائے مندرجہ ذیل ہے:-

جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ مارک اَپ کی شکل میں اختیار کئے جانے والے طریقے میں بیعِ مؤجل کے ساتھ عائد پابندیوں کی خلاف ورزی کی جارہی ہے، جبکہ اس طریقے کی اجازت ان شرائط کی پابندی کرنے پر ہی منحصر ہے۔ دُوسری بات جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ قلب میں تبدیلی اور قرآنی اَحکام کے ماننے کے عہد کی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ اسلامی معاشی نظام کو نافذ کرنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔ صرف زبانی جمع خرچ سے یا ناموں کے استعمال سے مطلوبہ تبدیلی نہیں لائی جاسکتی ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ نفع نقصان میں شرکت کے نظام میں غلطیاں اور خرابیاں شروع ہوجانے کی وجہ سے ہی بیعِ مؤجل کو جائز طریقوں کی فہرست سے نکالنے کی تجویز پیش کی گئی اور اس اُصول پر عمل کیا گیا کہ جو چیز کسی ناجائز عمل کی طرف رہنمائی کرتی ہو، خود بھی ناجائز ہے۔ اس لئے یہ دلیل پیش کی گئی کہ جو چیز رِبا کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اسے روک دیا جائے اور اس کی اجازت نہ دی جائے۔ فقہاء نے مرابحہ یا بیعِ مؤجل کے جائز ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط عائد کی ہیں:-

(I) معاوضے کی ادائیگی کا وقت معلوم ہونا چاہئے۔

(II) خریدار کے حوالے کرنے سے پہلے وہ چیز فروخت کنندہ کے پاس ہونی چاہئے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی رپورٹ میں مارک اَپ سسٹم یا بیعِ مؤجل

کے استعمال کو محدود پیمانے پر ضروری صورتوں میں اس وقت کے لئے منظور کرلیا تھا جب تک کہ نظام بغیر سودی نظام میں تبدیل نہیں ہو جاتا۔ اور تنبیہ کہ تھی کہ اس کا وسیع پیمانے پر یا بے دریغ استعمال نہ کیا جائے، کیونکہ اس میں یہ خطرہ موجود تھا کہ کہیں اس کی آڑ میں سود کی بنیاد پر کاروبار کا دروازہ نہ کھل جائے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اس تنبیہ پر توجہ نہیں دی گئی اور جنوری 1981ء میں شروع کیا جانے والا مارک اَپ سسٹم بیع مؤجل کی معیاری شرائط پر پورا نہیں اُترا۔ یہ بات نوٹ کرنا بھی ضروری ہے کہ بیعِ مؤجل دُنیا کے اسلامی بینکوں میں سب سے زیادہ استعمال کئے جانے والا مالیاتی طریقہ ہے۔ مندرجہ ذیل ٹیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ مرابحہ یا بیعِ مؤجل اسلامی بینکوں میں سب سے زیادہ استعمال کیا جانے والا طریقہ ہے۔ اسلامک ڈویلپمنٹ بینک کی طرف سے بنچ کو مہیا کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق اسلامی بینکوں کی کل مالیات میں اس طریقے کا اوسط حصہ 66 فیصد ہے۔ اسلامی بینکوں کی مالیات کے مختلف طریقوں کا اوسط 1996 - 1994 کے دوران مندرجہ ذیل تھا:-

ادارہ	کل مالیات (امریکی ڈالر ملین)	مرابحہ	مشارکہ	مضاربہ	لیزنگ	دُوسرے طریقے
البرکۃ اسلامک بینک فار انویسٹمنٹ	119	82	7	6	2	3
بحرین اسلامک بینک	320	93	5	2	0	1
فیصل اسلامک بینک	945	69	9	6	11	5
بنگلہ دیش اسلامک بینک لمیٹڈ	309	52	4	17	14	14
دبئی اسلامک بینک	1300	88	1	6	0	5
فیصل اسلامک بینک مصر	1364	73	13	11	3	0
اُردن اسلامی بینک	574	62	4	0	5	30
کویت فنانس ہاؤس	2454	45	20	11	1	23

برہارڈ اسلامی ملیشیا بینک	580	66	1	1	7	24
قطر اسلامک بینک	598	73	1	13	-	8
کل (دس بینک)	8563					
اوسط		66	10	8	4	13

مارک اَپ سسٹم کی اس پر عائد شرائط کے ساتھ اسلامی مالیاتی نظام میں اجازت ہے، لیکن اس پر عائد شرائط کی اگر کوئی شخص پابندی نہیں کرتا تو اسے اسلامی اَحکام کے متصادم نہیں کہا جا سکتا، شرائط کی خلاف ورزیاں اس لئے ہوتی ہیں کہ ایسی غلطیوں اور خلاف ورزیوں کو چیک کرنے کا کوئی مانیٹرنگ نظام نہیں ہے۔ جس مجوزہ نظام کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں قائم شریعت بورڈ اختیار کرے گا، اور جو دُوسرے مالیاتی اداروں میں اختیار کیا جائے گا اس نظام کی خلاف ورزیاں جب نظر آئیں گی تو ان کی نشاندہی کی جائے گی اور انہیں ختم کر دیا جائے گا، اس کے علاوہ جب اس نظام کو خلوص اور مصمم ارادے کے ساتھ اسلامی قوانین نافذ کرنے کے لئے آگے بڑھایا جائے گا، ان غلطیوں کو دُور کر دیا جائے گا، مقررہ حدود میں رہتے ہوئے مارک اَپ سسٹم اختیار کرنا عبوری دور کے معاشی نظام کی ایک ضرورت ہے، اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک شریعت کے بتائے ہوئے مزید مالیاتی طریقے مناسب تعداد میں ترقی نہیں پا جاتے، متذکرہ بالا حقائق کی روشنی میں ہمیں نگوشی ایبل انسٹرومنٹس ایکٹ 1881 کی دفعات کا جائزہ لینا چاہئے، اس کے بعد اسے صرف ایکٹ 1881 کہا جائے گا۔

متذکرہ بالا فیصلے سے متصادم ہونے والی پہلی دفعہ ایکٹ 1881 کی دفعہ 79 ہے، جو مندرجہ ذیل ہے:-

''قرض داروں کو فائدہ پہنچانے والے رائج الوقت کسی بھی قانون کی دفعات کے مطابق اور سول پراسیجر کوڈ 1908 کی سیکشن 34 کی دفعات کو متاثر کئے بغیر

(a) جب کسی پرامزری نوٹ یا بل آف ایکسچینج کے ذریعے سود (کسی شکل میں بھی معاوضہ) کسی مقررہ شرح پر دینا طے ہوجاتا ہے اور وہ تاریخ مقرر نہیں کی جاتی جب سے سود ادا کرنا ہے تو یہ اصل زر کی رقم پر مقررہ شرح سے اس نوٹ کی تاریخ سے شمار کیا جائے گا اور بل آف ایکسچینج کی صورت میں اس تاریخ سے شمار کیا جائے گا جب سے رقم کی ادائیگی واجب ہوگی، اس وقت تک شمار کیا جائے گا جب تک وہ رقم واپس نہیں کردی جاتی یا اس رقم کی واپسی کے لئے مقدمہ دائر نہیں کردیا جاتا۔''

(b) اگر کوئی پرامزری نوٹ یا بل سود کے بارے میں خاموش ہے اور اس میں سود کی شرح کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، تو سود کے بارے دونوں فریقوں کے درمیان ہونے والے کسی معاہدہ کو متاثر کیے بغیر اصل زر کی رقم پر سود کا فیصد سالانہ کی شرح سے ادا کیا جائے گا سود نوٹ کی تاریخ سے اور بل کی صورت میں اس تاریخ سے ادا کیا جائے گا جب سے رقم واجب الادا ہوجائے اور یہ اس تاریخ تک جاری رہے گا جب تک کہ رقم واپس نہ کردی جائے یا رقم کی واپسی کے لئے مقدمہ نہ دائر کردیا گیا ہو، بشرطیکہ کسی دستاویز کے ذریعے واجب رقم پر معاوضہ سود کے علاوہ کسی اور شکل میں ادا کرنا ہو تو اس رقم پر اگر معاوضہ کی شرح نہ مقرر کی گئی ہو تو مندرجہ ذیل شرح سے مقرر کیا جائے گا:-

(i) اگر معاوضہ قیمت، لیز، ہائر پرچیز یا سروس چارجز کے مارک اَپ کی بنیاد پر دیا جاتا ہے تو مارک اَپ، کرایہ یا سروس چارجز کی طے شدہ شرح کے مطابق ادا کیا جائے گا۔

(ii) اگر معاوضہ نفع نقصان میں شراکت کی بنیاد پر ادا کیا جاتا ہے تو یہ اس شرح سے ادا کیا جائے جسے عدالت دُرست اور مناسب خیال کرے گی اور اس سلسلے میں بینک اور قرض حاصل کرنے والے شخص کے درمیان طے ہونے والے اس معاہدے کو بھی مدنظر رکھا جائے گا جو قرض لیتے وقت کیا گیا تھا۔

(a)(c) اور (b) کی دفعات کو متاثر کئے بغیر کسی ایسی رقم کا معاوضہ جو سود کے علاوہ کسی اور شکل میں ہوگا اس وقت سے شروع ہوگا جب معاہدے کے مطابق یہ رقم واجب ہو جائے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک یہ رقم ادا نہ کردی جائے۔

وفاقی شرعی عدالت نے حکم دیا ہے کہ سود یا کسی اور شکل میں معاوضے کے بارے میں ذیلی دفعات (a) اور (b) کے مندرجات کو حذف کردیا جائے۔ ہم وفاقی شریعت عدالت سے متفق ہیں کہ پرامزری نوٹ یا بل آف ایکسچینج پر معاوضہ جس کا سیکشن79 کی ذیلی دفعات (a) اور (b) میں ذکر کیا گیا ہے، ربا ہے، اور یہ شریعت کے مطابق ناجائز ہے، اسی لئے یہ دونوں ذیلی دفعات قرآن اور سنت کے اسلامی احکام سے متصادم قرار دی گئی ہیں، کیونکہ وفاقی شریعت عدالت نے سیکشن79 کی دفعہ (i) میں دیئے گئے مندرجات کا اچھی طرح تجزیہ نہیں کیا ہے، اس لئے اس میں ریکارڈ کئے گئے نقطہ نظر میں تصحیح کی ضرورت ہے، متذکرہ بالا دفعہ (i) میں کسی پرامزری نوٹ یا بل آف ایکسچینج کا معاوضہ شمار کرنے کے مختلف طریقے دیئے گئے ہیں، اگر ان کی بنیاد پر مارک اپ، لیز، ہائر پرچیز اور سروس چارج پر رکھی گئی ہو۔ وفاقی شریعت عدالت نے اس کلاز کے بارے میں اپنے فیصلے کی بنیاد مارک اَپ، لیز، ہائر پرچیز اور سروس چارج کے جائز یا ناجائز ہونے پر رکھی ہے۔ مارک اَپ کو جس طرح کہ یہ اس وقت رائج ہے، وفاقی شریعت عدالت نے ناجائز قرار دیا ہے اور اسی لئے اسے حذف کردیا گیا ہے جبکہ لیز، ہائر پرچیز اور سروس چارج کو برقرار رکھا گیا اور انہیں اسلامی احکام سے متصادم قرار نہیں دیا گیا، سیکشن79 اور اس کی تمام دفعات کے بغور مطالعے اور صحیح تناظر میں تجزیئے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سیکشن79 کا مقصد مارک اَپ، لیز وغیرہ کے کسی سودے میں معاوضے کو جائز یا ناجائز قرار دینا نہیں ہے۔ کلاز(i) کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اگر ایک بار پرامزری نوٹ یا بل آف ایکسچینج ان بنیادوں پر

جاری کر دیا گیا اور اگر انہیں جاری کرنے والا مدّت پوری ہونے پر رقم ادا نہیں کر سکا تو عدالت نوٹ یا بل کے حامل کو اس مدّت کے معاوضہ ادا کرنے کا حکم دے سکتی ہے، جس مدّت کے دوران واجب الادا ہونے کے بعد یہ رقم ادا نہیں کی گئی۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھنے سے یہ دفعہ اپنی موجودہ شکل میں مکمل طور پر اسلامی اَحکام کے خلاف ہے، بغیر اس بات کا خیال کئے ہوئے کہ اس معاہدے کے تحت مارک اَپ، لیز وغیرہ شریعت کے مطابق ہیں یا نہیں، اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:-

ایکٹ 1881 میں سیکشن 79 ابتدائی طور پر ایسے معاہدوں کے لئے بنائی گئی تھی جو سود والے قرضوں کے بارے میں تھے، سود کی قسم ایسی تھی جو روزانہ کی بنیاد پر شمار کیا جاتا تھا۔ اور جب تک رقم ادا نہ کردی جائے، اس میں برابر اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اس اُصول کی بنیاد پر سیکشن 79 میں ایسی صورتوں کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا جہاں مقروض مقرّرہ مدّت ختم ہونے پر قرضہ ادا نہ کر سکے۔ یہ بات فرض کر لی گئی تھی کہ قرضے کی عدم ادائیگی کے ہر روز کے لئے قرضہ دینے والے کو مزید سود یا معاوضہ ملنا چاہئے۔ ذیلی دفعہ (a) میں کہا گیا ہے کہ اگر معاہدے میں قرضے کی ابتدائی مدّت کے لئے سود کی کوئی شرح مقرّر کی گئی ہے تو باقی عدم ادائیگی کی مدّت کے دوران بھی سود اسی شرح سے وصول کیا جائے گا۔ ذیلی دفعہ (b) میں ایسی صورت کو نظر میں رکھا گیا ہے جہاں معاہدے میں سود کی کوئی شرح مقرّر نہیں کی گئی، چاہے اس وجہ سے کہ ابتدائی مدّت کے لئے قرضہ بغیر سود کے دیا گیا تھا یا اس لئے کہ سود کی رقم یک مشت رکھی گئی تھی، اس صورت میں قانونی طور پر سود کی شرح کا 6 فیصد سالانہ مقرّر کی گئی ہے۔

جب 1980ء میں حکومت نے سود کے خاتمے کا اعلان کیا اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے کچھ متبادل طریقوں کی اجازت دے دی، جیسے مارک اَپ، لیزنگ، ہائر پرچیز اور سروس چارج تو قوانین میں کچھ ترامیم کی گئیں۔ اسی پسِ منظر میں سیکشن 79 میں یہ دفعہ شامل کی گئی اور سود کی بنیاد پر جاری کئے گئے نوٹس اور بلز پر نافذ

کی جانے والی دفعات مارک اَپ، لیز، ہائر پرچیز اور سروس چارج کی بنیاد پر جاری کی جانے والی دستاویزات پر بھی ذیلی دفعہ میں دیئے گئے طریقے کے مطابق لاگو کی جانے لگیں اور یہ خیال نہیں کیا گیا کہ یہ تمام معاہدے سود کی بنیاد پر قرضوں کے معاہدوں سے بالکل مختلف ہیں اور ان پر وہ قوانین نافذ نہیں کئے جاسکتے جو سود والے قرضوں کے معاہدوں کے لئے بنائے گئے ہیں، ان چاروں قسم کے معاہدوں کی اپنی خصوصیات ہیں اور ان پر علیحدہ طریقوں سے غور کیا جائے۔

ہم ان میں سے ہر معاہدے کا علیحدہ علیحدہ تجزیہ کرتے ہیں۔

پہلا طریقہ جس کا ذیلی دفعہ (i) میں ذکر کیا گیا ہے، قیمت پر مارک اَپ کا طریقہ ہے، اس طریقۂ کار سے مطلب بیعِ مؤجل ہے، جس کی تفصیلات متذکرہ بالا پیراگرافوں اور جسٹس محمد تقی عثمانی کے فیصلے کے پیرا (189) اور (218) میں بھی دی گئی ہیں، کہا گیا ہے کہ اس طریقے کی تجویز اسلامی نظریاتی کونسل نے پیش کی تھی مگر بینکوں نے جب اسے عملی طور پر نافذ کیا تو بگاڑ کر بدترین شکل بنادی، اس لئے وفاقی شریعت عدالت کو کہنا پڑا: ''مارک اَپ سسٹم جیسا کہ اب یہ رائج ہے، اسلامی اَحکام سے متصادم قرار دیا جاتا ہے۔'' (وفاقی شریعت عدالت کے فیصلے کا پیرا262) اور پھر عدالت نے حکم دیا کہ اس ذیلی دفعہ سے مارک اَپ کے الفاظ حذف کردیئے جائیں۔

ہم یہ فیصلہ پہلے ہی دے چکے ہیں کہ مارک اَپ سسٹم جو اس وقت ہمارے بینکوں میں رائج ہے، اسلامی اَحکام کے خلاف ہے، مگر یہ کہنا دُرست نہیں ہے کہ بیعِ مؤجل کے طریقے کو بھی ممنوع قرار دیا گیا ہے، اگر اس طریقے میں اُوپر دی گئی شرائط پوری کی گئی ہوں تو اسے اسلامی اَحکام کے متصادم نہیں کہہ سکتے، لیکن اس کلاز میں اس طریقے کا حوالہ جو پرامزری نوٹ یا بل آف ایکسچینج کے معاوضے کے پسِ منظر میں ہے، بیعِ مؤجل کے بنیادی اُصولوں کے مطابق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیعِ مؤجل خریداری کا ایسا طریقہ ہے جس میں ادائیگی بعد میں کی جاتی ہے۔ اس طریقے

کی بنیادی شرط یہ ہے جس طرح خریداری کے دوسرے طریقوں میں ہوتا ہے کہ خریداری معاہدہ ہوتے وقت ہی قیمت طے کرلی جاتی ہے، اس قیمت میں مارک اَپ بھی شامل ہوسکتا ہے (فروخت کرنے والے کے جو اخراجات ہوئے ہیں اس میں نفع بھی شامل کردیا جاتا ہے)، مارک اَپ کی رقم مقرر کرنے میں فروخت کنندہ مختلف عوامل پر غور کرتا ہے جس میں دیر سے ادائیگی ہونا بھی شامل ہوتا ہے، لیکن جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے جب ایک بار قیمت مقرر ہوجائے تو یہ کسی چیز کے متعلق ہوتی ہے اور اسے یک طرفہ طور پر گھٹایا یا بڑھایا نہیں جاسکتا، کیونکہ جیسے ہی فروخت مکمل ہوتی ہے اس چیز کی قیمت قرض ہوجاتی ہے جو خریدار کو ادا کرنا ہے۔

اس واجب رقم کے ثبوت کے لئے اگر کوئی بل آف ایکسچینج یا پرامزری نوٹ تحریر کیا گیا ہے تو قرضے کے لئے لکھے گئے نوٹ یا بل سے یہ مختلف نہیں ہوگا، اور اس بل یا نوٹ پر کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا جاسکے گا، کیونکہ یہ واجب رقم پر سود لینے کے مترادف ہوگا۔

سیکشن 79 کی سب کلاز (i) میں کہا گیا ہے کہ اگر بیع مؤجل میں خریدار قیمت ادا نہیں کرتا جس کے ثبوت کے لئے پرامزری نوٹ یا بل آف ایکسچینج لکھا گیا ہے تو خریدار کو ابتدائی مارک اَپ کی شرح سے اس وقت تک کے لئے مزید معاوضہ ادا کرنا پڑے گا جب تک کہ واجب الادا ہونے کے بعد یہ قیمت ادا نہیں کی گئی ہو۔ مثال کے طور پر الف نے ایک چیز 100 روپے میں خریدی، ب اس سے 10 فیصد مارک اَپ پر یہ چیز خریدنے کے لئے رضامند ہے، اس طرح یہ چیز ب کو 110 روپے قیمت پر فروخت کردی جاتی ہے جو ایک سال بعد 31 جنوری کو ادا کرے گا۔ ب الف کے حق میں 110 روپے کے پرامزری نوٹ پر دستخط کردیتا ہے، یہ پرامزری نوٹ ایک ایسی دستاویز ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ب کو یہ رقم الف کو ادا کرنا ہے، جس میں وہ مارک اَپ بھی شامل ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ اگر ب

110 روپے کی رقم 31 جنوری تک ادا نہیں کرتا تو ایکٹ 1881 کی سیکشن 79 کی سب کلاز (i) کے مطابق ب اسی شرح سے یعنی مثال میں 10 فیصد سے الف کو اس مدت کے لئے مزید معاوضہ ادا کرے گا جب تک کہ 31 جنوری کے بعد یہ رقم ادا نہیں ہوجاتی۔ یہ دفعہ اسلامی احکام سے متصادم ہے، کیونکہ جب قیمتِ خرید کی رقم قرض ہوجاتی ہے تو فروخت کنندہ اس پر معاوضہ طلب نہیں کرسکتا، اگر خریدار اپنی غربت کی وجہ سے مقررہ مدت میں رقم ادا نہیں کرسکتا تو اس بارے میں قرآن کا حکم واضح ہے کہ اسے اس وقت تک مزید مہلت دی جائے جب تک کہ وہ رقم ادا کرنے کے قابل ہوجائے، قرآن شریف میں کہا گیا ہے:-

اگر مقروض غریب ہے تو اسے اس وقت تک مہلت دی جائے جب تک وہ خوش حال نہ ہوجائے۔

لیکن اگر خریدار ادائیگی کی صلاحیت رکھنے کے باوجود تاخیر کر رہا ہے تو اسے دُوسری سزائیں دی جاسکتی ہیں، لیکن اس وجہ سے خریدار کو شرح فیصد کے حساب سے مزید معاوضہ ادا نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ سیکشن 79 میں دیا گیا ہے، اس مسئلے پر جسٹس محمد تقی عثمانی کے فیصلے کے پیرا (51) میں بحث کی گئی، قرآن کی یہ آیت بھی اسی پس منظر میں نازل ہوئی ہے -

ترجمہ:- وہ کہتے ہیں کہ بیع ربا کی طرح ہے، حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربا کو حرام۔"

اس لئے ہم وفاقی شریعت کورٹ کے اس فیصلے سے متفق ہیں کہ سیکشن 79 کی سب کلاز (i) میں مذکورہ قیمت پر مارک اَپ کے الفاظ اسلامی احکام سے متصادم ہیں، لیکن مارک اَپ کا معاہدہ خود ممنوع نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز مارک اَپ کی بنیاد پر خریدی گئی ہے اور اس کی قیمت کا پرامزری نوٹ یا بل آف ایکسچینج میں ذکر ہے اور اس میں ابتدائی مارک اَپ بھی شامل ہے تو شریعت کے مطابق ابتدائی مارک اَپ کی بنیاد

پر مزید کسی معاوضے کی اجازت نہیں ہے۔

دوسرا طریقہ جس کا سب کلاز (i) میں ذکر کیا گیا ہے لیز کا ہے، لائق وفاقی شریعت کورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ لیز کا طریقہ کیونکہ جائز ہے، اس لئے لیز کے بارے میں سب کلاز (i) میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے وفاقی شریعت کورٹ نے اس بات پر توجہ نہیں دی کہ یہ کلاز لیز کو قانونی بنانے کے لئے نہیں ہے، یہ آگے جاتی ہے۔ یہ کہتی ہے کہ لیز کے معاہدے میں کرائے کی ادائیگی کے لئے ثبوت کے طور پر پرامزری نوٹ یا بل آف ایکسچینج لکھا گیا ہے اور مقررہ تاریخ پر کرایہ ادا نہیں کیا گیا ہے، تو اس نوٹ یا بل کے ذریعے کرایہ دار خود بخود ابتدائی شرح سے مزید معاوضہ ادا کرنے کا پابند ہوگا۔ ہم ایک مثال کے ذریعے یہ بات سمجھتے ہیں۔ الف نے ب کو یکم فروری کو 5 سال کے لئے ایک ایکیوپمنٹ کرایہ پر دیا، فریقین کے درمیان کرایہ کی مجموعی رقم 100000 روپے طے ہوئی جو ماہانہ اقساط میں ادا کی جانی تھی، ب نے پرامزری نوٹ پر دستخط کئے کہ 100000 روپے کی رقم 31 جنوری 2004ء کو ادا کردی جائے گی۔ کرایہ مقرر کرتے وقت مالک نے اس ایکیوپمنٹ کی جو قیمت ادا کی تھی اس پر 5 فیصد سالانہ کی شرح سے اپنا منافع بھی رکھا۔ اگر ب 31 جنوری 2004ء تک 100000 روپے کی پوری رقم ادا نہیں کرتا تو سب کلاز (i) کے مطابق الف اس پرامزری نوٹ کی بنیاد پر 5 فیصد سالانہ کی شرح سے مزید معاوضہ وصول کرنے کا حق دار ہوگا، یہ ہی شرح کرایہ مقرر کرتے وقت سامنے رکھی گئی تھی، اس طرح اس قرض میں روزانہ کی بنیاد پر اس وقت تک اضافہ ہوتا جائے گا جب تک رقم ادا نہیں ہوجاتی۔

شریعت کے مطابق صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ جب کرایہ دار مقررہ مدت تک وہ چیز استعمال کرچکا تو کرایہ کی رقم اس کے اُوپر قرض ہوگئی اور اس پر وہی قواعد و ضوابط نافذ ہوں گے جو قرضے پر ہوتے ہیں، اور جیسا کہ مارک اَپ کے سلسلے میں کہا

گیا ہے کہ اگر مقروض شخص اپنی غربت کی وجہ سے قرضہ ادا نہ کر سکے تو اسے مزید وقت دیا جائے گا۔ قرآن شریف کے حکم کے مطابق اگر وہ جان کر تاخیر کر رہا ہے تو اس کے خلاف تادیبی اقدامات کئے جائیں گے، لیکن اس تاخیر کو مزید معاوضہ ادا کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھا جائے گا، جیسا کہ سب کلاز (i) میں دیا گیا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اگر کرایہ دار نہ تو کرایہ ادا کرتا ہے اور نہ ہی وہ کرایہ پر لی جانے والی چیز واپس کرتا ہے اور کرایہ کی مدت گزر جانے کے بعد بھی اسے اپنے قبضے میں رکھتا ہے تو اس مدت کے لئے جس میں وہ چیز اس کے قبضے میں رہتی ہے وہ وہی کرایہ ادا کرے گا جو شروع میں مقرر کیا گیا تھا، مگر یہ اس وجہ سے ہوگا کہ مدت گزرنے کے بعد بھی اس نے اس چیز کو استعمال کیا ہے اور یہ معاوضہ پہلے سے واجب کرایہ کی عدم ادائیگی کی وجہ سے نہیں ہوگا۔

ہائر پرچیز

اس سب کلاز میں ذکر کیا جانے والا تیسرا طریقہ ہائر پرچیز کا ہے، لائق وفاقی شریعت کورٹ نے اس طریقے پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے:-

''اس دفعہ میں استعمال کی جانے والی ایک اصطلاح ہائر پرچیز کی ہے، اس طریقے کے تحت بینک مشترکہ ملکیت کے تحت ان چیزوں کی سیکورٹی کے ساتھ یا بغیر سیکورٹی کے خریداری کے لئے رقم مہیا کریں گے، انہیں اصل رقم کی واپسی کے ساتھ کرایہ میں حصہ بھی ملے گا۔''

لائق وفاقی شریعت کورٹ نے خریداری کے معاہدے کی صحیح طور پر تشریح نہیں کی، اسے شراکت داری کا تصور سمجھ لیا ہے۔ ہائر پرچیز کی صحیح نوعیت چیٹ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کی ہے:-

''ہائر پرچیز معاہدے کو ایک ایسا معاہدہ کہا جا سکتا ہے جس کے تحت کوئی

مالک اپنا کسی قسم کا بھی مال کرایہ پر دے دیتا ہے اور اس بات پر بھی رضامندی کا اظہار کرتا ہے کہ یا تو کرایہ دار مال واپس کر کے معاہدہ ختم کر دے یا جب کرایہ کی رقم معاہدے میں دی گئی مال کی قیمت کے برابر ہوجائے تو اسے ادا کر کے یا بیان کی گئی رقم ادا کر کے اسے خریدے۔ اس معاہدے کی بنیاد (i) مالک کی طرف سے کرایہ دار کو کرایہ پر مال دینا اور (ii) وہ معاہدہ ہے جس کے تحت کرایہ دار وہ مال یا تو واپس کر دے گا یا کسی وقت خریدے گا۔'' یہ معاہدہ مارکیٹ میں مختلف شکلوں میں استعمال کیا جاتا ہے جن میں سے کچھ شکلیں ایسی ہیں جن میں ایسے عناصر موجود ہوتے ہیں جو شریعت کے مطابق نہیں ہوتے، لیکن یہاں اس کی تفصیلات میں جانا مناسب نہیں۔ اگر ہائر پرچیز کے طریقے کو چوٹی کی بنائی ہوئی صحیح شکل میں استعمال کیا جائے اور اس میں شریعت کے اُصولوں کی خلاف ورزی نہ ہو، تو بھی اس کلاز میں اس طریقے کے جائز ہونے کے سوال کو نہیں اُٹھایا گیا ہے۔ یہاں پر سوال ایسے پرامزری نوٹ یا بل آف ایکسچینج کی بنیاد پر معاوضے کی ادائیگی کا ہے جس میں ہائر پرچیز کے معاہدے کے مطابق کرایہ ادا کرنا لازم ہے، اس لئے اس میں بھی وہی فیصلہ نافذ ہوگا جو لیز کے معاملے میں ہوا ہے۔

سروس چارجز

اس کے بعد کلاز (i) میں سروس چارج کا ذکر کیا گیا ہے، وفاقی شریعت کورٹ نے یہ فیصلہ دُرست کیا ہے کہ وہ سروس چارج جو کہ دستاویز تیار کرنے کے اصل اخراجات پر مبنی ہو اور جو قرضہ دینے والا قرض دینے کے سلسلے میں برداشت کرتا ہے، قرضہ لینے والے سے طلب کرسکتا ہے۔ یہ اُصول قرآن شریف کی مندرجہ ذیل آیت سے اخذ کیا گیا ہے:-

وَلْيُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَيْهِ الْحَقُّ.

(اور وہ شخص لکھوادے جس کے ذمہ حق واجب ہے)

یہاں پر قرضے کی دستاویز کی تیاری کی ذمہ داری قرضہ لینے والے پر ڈالی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دستاویزات کی تیاری میں کوئی اخراجات آتے ہیں تو انہیں قرضہ لینے والا برداشت کرے گا۔

اس میں یہ اُصول بتایا گیا ہے کہ قرض کے کسی معاہدے میں دستاویزات کی تیاری کی قسم کے اخراجات کا قرض دینے والا دعویٰ کرسکتا ہے لیکن اس شرط پر کہ وہ حقیقتاً اصل اخراجات پر مبنی ہیں اور صرف سود لینے کا کوئی بہانہ نہیں ہیں، لیکن زیرِ بحث کلاز میں یہ سوال نہیں اُٹھایا گیا کہ سروس چارج جائز ہے یا نہیں؟ اس کلاز میں یہ خیال زیر غور رکھا گیا ہے کہ اگر کسی پرامزری نوٹ یا بل آف ایکسچینج سے سروس چارج ادا کرنے کی ذمہ داری ثابت ہے اور مقررہ تاریخ پر اس کی ادائیگی نہیں کی جاتی تو نوٹ یا بل خود بخود قرض دار پر لازم کردے گا کہ وہ نوٹ یا بل پر سروس چارج کی اس شرح سے معاوضہ ادا کرے جو شروع میں شمار کیا گیا تھا۔

اب یہ بات ظاہر ہے کہ سروس چارج کی اصل خرچے کی بنیاد پر اجازت دی گئی ہے اور کسی خاص شرح سے معاوضے کی بنیاد پر نہیں۔ قرضے دینے میں دستاویزات کے اخراجات صرف شروع میں ہوتے ہیں جب قرضہ دیا جاتا ہے، اور انہیں شروع کے سروس چارج میں شامل کرلیا جاتا ہے جس کا پرامزری نوٹ میں ذکر ہوتا ہے۔

عام طور پر یہ بار بار ہونے والے خرچے نہیں ہوتے، اگر رقم ادا کرنے کی تاریخ کے بعد کوئی ایسا خرچہ ہوتا ہے جیسے ریمائنڈ بھیجنے پر تو وہ اس شرح سے نہیں ہوتا، جس پر شروع میں سروس چارج شمار کیا گیا تھا، وہ کم بھی ہوسکتا ہے، اور اگر قرض دینے والا قانونی چارہ جوئی شروع کردے تو زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔

سب کلاز (ii)

اب ہم 1881 کے ایکٹ کے سیکشن 79 کی سب کلاز (ii) کی طرف آتے ہیں، جو کہ مندرجہ ذیل ہے:-

''نفع اور نقصان میں شراکت کی بنیاد پر معاوضے کی شرح وہ ہوگی جو شرح عدالت اس مقدمے کے حالات میں منصفانہ اور مناسب خیال کرتی ہے، اور نفع میں شرکت کے اس معاہدے کو بھی زیرِ غور رکھا جائے گا، جو بینکنگ کمپنی اور قرض دار کے درمیان قرض لیتے وقت ہوا تھا۔''

یہ فرض کرتے ہوئے کہ اس کلاز میں نفع نقصان میں شرکت کے بارے میں بتایا گیا ہے جو کہ شریعت کے خلاف نہیں ہے، وفاقی شریعت عدالت نے اسے چھوا تک نہیں، بلکہ سیکشن 80 کی ایک متوازی دفعہ کے لئے کہا کہ یہ اسلامی اَحکام کے خلاف ظاہر نہیں ہوتی، لیکن اس کلاز کی وضاحت کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے تو الفاظ ''قرضہ لیتے وقت'' جو کلاز کے آخر میں آئے ہیں، گمراہ کرنے والے ہیں، نفع نقصان کی بنیاد پر روپیہ لگانا قرضہ نہیں ہے، لہٰذا یہ لفظ بھی غلط استعمال کیا گیا ہے۔ دُوسرے جس تناسب سے شراکت داروں میں نفع تقسیم کیا جانا طے ہوا ہے وہ اس وقت تک قابلِ عمل رہے گا جب تک مشارکہ حتمی طور پر طے یا ختم نہیں ہوجاتا، یہاں تک تو یہ دفعہ صحیح ہے، لیکن اس کلاز میں استعمال کی جانے والی زبان ایک ایسی صورتِ حال کا احاطہ بھی کرتی ہے جہاں فائنانسر شراکت ختم ہونے کے بعد بھی نفع کی کسی رقم کا حق دار ہے اور وہ ایک عرصے سے ادا نہ کی گئی ہو، اس کلاز کے الفاظ قرضہ دینے والے کو غیرادا شدہ رقم پر اسی شرح پر مزید معاوضے کا دعویٰ کرنے کی اجازت بھی دیتی ہیں جس پر سے نفع دینا طے ہوا تھا، یہ بات بھی قابلِ اعتراض ہے، کیونکہ اگر بزنس بالکل ختم کردیا گیا اور قرض دار کے پاس صرف وہ رقم

باقی بچتی ہے جس پر قرضے کی رقم واپس لینے کے لئے فائنانسر کا حق ہے تو اس پر کوئی معاوضہ لینا جائز نہیں، کیونکہ یہ قرضے پر سود ہوگا۔

متذکرہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ مارک اَپ، لیزنگ، ہائر پرچیز، سروس چارجز اور شراکت کے کاروبار چند شرائط کے ساتھ جائز ہیں، لیکن سیکشن 79 کے مطابق پرونوٹ یا بل آف ایکسچینج پر جس طرح مزید معاوضہ دیا گیا ہے وہ قرضے پر معاوضہ ہے اور یہ سود کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ سیکشن مکمل طور پر اسلامی اَحکام سے متصادم ہے، اگرچہ اس سیکشن 79 کی کلاز (ii) میں مشارکہ اور نفع نقصان میں شرکت کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس طرح کے کاروبار میں عام طور پر کسی پرامزری نوٹ یا بل آف ایکسچینج کی ضرورت نہیں ہوتی جس کے تحت قرض دار کو ایک خاص رقم ادا کرنا ہوتی ہے۔ لہٰذا اس نامکمل کلاز کو قائم رکھنے سے اسے ایسی صورتِ حال میں استعمال کیا جاسکے گا جس کے لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس صورت میں مزید معاوضہ جائز نہیں ہے۔ جب تک فائنانسر کے حصے کی رقم بزنس میں رہتی ہے وہ بزنس میں ہونے والے اصل نفع کی رقم پر مزید معاوضے کا حق دار ہوگا لیکن مشارکہ کی دستاویز میں اس کا ذکر ہونا چاہئے، موجودہ صورتِ حال میں اس کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لئے سیکشن 79 کو مکمل طور پر اسلامی اَحکام سے متصادم قرار دیا گیا ہے۔

سیکشن 80

1881 کے ایکٹ کی سیکشن 80 بھی سیکشن 79 کی طرح ہے، اسی لئے وفاقی شریعت عدالت نے اس کے بارے میں بھی وہی فیصلہ دیا ہے جو سیکشن 79 کے بارے میں ریکارڈ کیا تھا، اور وفاقی شریعت کورٹ کے فیصلے پر ہماری بھی وہی رائے ہے جو ہم نے سیکشن 79 کے بارے میں تفصیل سے دی ہے، اس لئے سیکشن 79 کی طرح

سیکشن80 کے بارے میں بھی یہ ہی فیصلہ دیا جاتا ہے کہ یہ مکمل طور پر اسلامی اَحکام سے متصادم ہے۔

1881 کے ایکٹ کی سیکشن114 اور (C)117 بھی اسلامی اَحکام کے خلاف ہیں، کیونکہ یہ دونوں دفعات سود کے بارے میں ہیں۔

سیکشن114 قرض دینے والے کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ ابتدائی طور پر قرض دینے والے سے بل آف ایکسچینج کی پابندی کرتے ہوئے اپنی رقم مع سود کے واپس لے سکتے اسی طرح سیکشن (C)117 میں انڈورسر کو جس نے بل کی رقم ادا کردی ہے یہ حق ملتا ہے کہ وہ اس رقم کو چھ فیصد سود کے ساتھ واپس لے سکے۔ دونوں دفعات کے تحت سود وصول کیا جاتا ہے، اس لائق وفاقی شریعت عدالت نے ان دونوں دفعات کو صحیح طور پر اسلامی اَحکام سے متصادم قرار دیا ہے۔ اس لئے وفاقی شریعت عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگرکسی فریق نے اس فیصلے کے نفاذ سے پہلے کوئی واجب رقم مع اس سود کے جوکسی معاہدے کے تحت لازم ہے، ادا کردی ہے تو اس طرح ادا کی جانے والی رقم معاہدے کی پابندی کی وجہ سے دُوسرے فریق کو وصول کرنا جائز ہوگی، 1881 کے ایکٹ پر بحث ختم کرنے سے پہلے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ ''نگوشی ایبل انسٹرومنٹ'' کی تشریح جیسا کہ یہ سیکشن13 میں کی گئی ہے یہ نہیں بتاتی کہ اس کوفروخت کیا جاسکتا ہے یا اسے منتقل کیا جاسکتا ہے یا رقم کم کرکے انڈورس کیا جاسکتا ہے، لیکن مالیاتی منڈیوں میں یہ پریکٹس رہی ہے کہ اسے سود کی بنیاد پر ڈسکاؤنٹ کیا جاتا ہے۔ یہ پریکٹس اسلامی اَحکام کے خلاف ہے اور اس میں رِبا شامل ہوجاتا ہے، کوئی پرامزری نوٹ یا بل آف ایکسچینج اس قرضے کی نمائندگی کرتا ہے جو مقروض اس بل یا نوٹ رکھنے والے کو ادا کرے گا۔ یہ قرضہ اصل قیمت کے سوائے کسی اور قیمت پر منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ کسی پرامزری نوٹ یا بل آف ایکسچینج پر ڈسکاؤنٹ کرنے میں سود شامل ہوجاتا ہے۔ اسلامی مالیاتی منڈی میں رقم یا

قرضے کی دستاویزات کی خرید و فروخت نہیں کی جاسکتی، البتہ جو کاغذات جیسے شیئرز، لیز سرٹیفکیٹس، مشارکہ سرٹیفکیٹس وغیرہ، کسی اثاثے کی ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں، ان کی تجارت ہوسکتی ہے، اور ان کے لئے ایک ڈوسری مارکیٹ کو ترقی دی جانی چاہئے۔

IV- دی لینڈ ایکوئزیشن ایکٹ 1894

1894 کے لینڈ ایکوئزیشن ایکٹ کی دفعات 28، 32، 33 اور 34 میں جہاں تک سود کا ذکر ہے انہیں فیصلے کے پیراگراف 279 سے 296 تک میں کی گئی بحث کے مطابق قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں دیئے گئے اسلامی اَحکام سے متصادم قرار دیا گیا ہے۔ دی لینڈ ایکوئزیشن ایکٹ کی دفعہ 28 مندرجہ ذیل ہے:-

"28 کلکٹر کو ہدایت دی جاسکتی ہے کہ وہ معاوضے کی مزید رقم پر سود ادا کرے، اگر عدالت کی رائے کے مطابق وہ رقم جو کلکٹر کو معاوضے کے طور پر دینا تھی اس رقم سے زیادہ ہے جو اس نے معاوضے کے طور پر دی ہے تو عدالت اپنے فیصلے میں ہدایت دے سکتی ہے کہ کلکٹر اس زائد رقم پر 6 فیصد سالانہ کی شرح سے زمین قبضے میں لینے کے وقت سے عدالت میں زائد رقم ادا کرنے کے وقت تک کے عرصے کے لئے سود ادا کرے۔" دفعہ 28 کے مطالعے سے ہی اس دفعہ کا مقصد ظاہر ہوجاتا ہے، یعنی زمین کے مالک کو معاوضہ ادا کرنا جسے اس کی زمین سے بغیر مناسب معاوضہ ادا کئے ہوئے محروم کردیا گیا تھا، اس طرح کی محرومی کا ایک مقرّرہ طریقۂ کار کے ذریعے اندازہ لگایا جائے، یعنی مالک کو 6 فیصد سالانہ شرح سے ادا کی جانے والی رقم کے فرق پر اس عرصے کے لئے معاوضہ ادا کیا جائے گا، جس عرصے میں وہ اپنی زمین سے محروم رہا ہے، جس اُصول کو نافذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مالک کو اس کی جائیداد سے اس وقت تک محروم نہیں کیا جاسکتا جب تک اسے معاوضے کے طور پر کافی اور مناسب قیمت ادا نہ کردی جائے، اور اس وقت تک ملکیت کے حقوق کو منتقل نہ سمجھا

جائے جب تک مناسب معاوضہ ادا نہ کردیا جائے۔ 1985 کے بلوچستان ایکٹ 13 کے ذریعے دفعہ 28 کو ترمیم کر کے متبادل دفعہ مندرجہ ذیل رکھی گئی ہے:-

''سیکشن 4 کے تحت نوٹیفکیشن کی تاریخ پر موجود مارکیٹ قیمت پر معاوضہ مقرر کرنے کے علاوہ 15 فیصد سالانہ کے حساب سے مقررہ معاوضے کی رقم پر سیکشن 4 کے تحت جاری ہونے والے نوٹیفکیشن کی تاریخ سے معاوضے کی ادائیگی کی تاریخ تک کی مدّت کے لئے مزید معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

سندھ میں ایڈیشنل معاوضہ ادا کرنے کے لئے 1984 کے سندھ آرڈیننس نمبر 23 کے ذریعے لینڈ ایکوزیشن ایکٹ میں سیکشن 28 کے بعد سیکشن 28A کا اضافہ کرکے اسی طرح کی دفعہ بنادی گئی ہے، لینڈ ایکوزیشن ایکٹ کی سیکشن 32 مندرجہ ذیل ہے:-

''32- ایسے لوگوں کی زمین کے لئے سرمایہ کاری کے لئے داخل کرائی گئی رقم جو اسے فروخت نہیں کر سکتے۔

(1) اگر آخر میں دی گئی دفعہ کی ذیلی دفعہ (2) کے تحت کوئی رقم عدالت میں جمع کرائی گئی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمین کے لئے یہ رقم جمع کرائی گئی ہے وہ کسی ایسے شخص کی ملکیت ہے جو اسے فروخت کرنے کا اہل نہیں ہے تو عدالت:-

(a) حکم دے گی کہ یہ ایسے دُوسری زمین کی خریداری میں لگائی جائے جو اسی طرح کی ملکیت کے حقوق حاصل ہے جس کے لئے یہ رقم لگائی جانی تھی یا

(b) اگر فوری طور پر ایسی خریداری ممکن نہیں ہے تو اس رقم کی حکومت کی یا دُوسری منظور شدہ سیکورٹیز میں سرمایہ کاری کی جائے، جہاں عدالت مناسب سمجھتی ہے اور عدالت اس بات کی بھی ہدایت کرے گی کہ اس سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والا سود یا دُوسرے فوائد اس شخص یا اشخاص کو ادا کئے جائیں جو اس وقت اس زمین کی ملکیت کے حامل ہیں، اور یہ جمع شدہ رقم اسی طرح سرمایہ کاری میں لگی رہے گی جب

تک اسے:-

(i) متذکرہ بالا زمین کی خریداری میں نہیں لگایا جاتا یا

(ii) ایسے شخص یا اشخاص کو ادا نہیں کر دیا جاتا جو مکمل طور پر اس کے حق دار ہو گئے ہوں۔

(2) جمع کی جانے والی رقم کے ان تمام معاملات میں جہاں یہ دفعہ نافذ ہوتی ہے، عدالت حکم دے گی کہ مندرجہ ذیل اخراجات جن میں متعلقہ مناسب اخراجات بھی شامل ہوں گے، کلکٹر ادا کرے گا:-

(a) متذکرہ بالا سرمایہ کاری کے اخراجات۔

(b) سود یا دُوسرے فوائد کی ادائیگی کے احکام کے لئے ان سیکورٹیز کے لئے جن میں وقتی طور پر رقم لگائی گئی ہے، عدالت سے باہر اصل زر کی رقم ادا کرنے کے اور ان سے متعلق دُوسری قانونی کاروائیوں کے لئے اخراجات سوائے دو دعویداروں میں آپس کی مقدمہ بازی کے اخراجات کے اس دفعہ کے تحت معاوضے کی رقم کی ادائیگی میں باقاعدگی پیدا کی گئی ہے جو دی لینڈ ایکوزیشن ایکٹ کی دفعہ 31 میں دی گئی وجوہات کی بنا پر مستحق مالک کو ادا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایسی رقم کو جو کہ عدالت میں پڑی ہوئی ہے دُوسری زمین کی خریداری میں لگایا جائے گا جس کے ملکیت کے حقوق اسی طرح کے ہوں گے جو اس زمین کے تھے جس کے لئے رقم جمع کرائی گئی تھی۔ اگر فوری طور پر ایسی خریداری ممکن نہیں ہے تو پھر ایسی سرکاری یا منظور شدہ سیکورٹیز میں لگا دی جائے۔ اس دفعہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والا سود یا دُوسرے فوائد عدالت کی ہدایت کے مطابق ایسے شخص یا اشخاص کو ادا کئے جائیں گے جن کو حاصل کی جانے والی زمین کی ملکیت کا مستحق پایا گیا۔

دفعہ 33 مندرجہ ذیل ہے:-

"کسی دُوسرے معاملے میں جمع شدہ رقم کی سرمایہ کاری جب رقم مذکورہ بالا

دفعہ میں دی گئی وجہ کے علاوہ کسی اور وجہ سے جمع کرائی گئی ہو تو رقم میں مفاد رکھنے والے یا مفاد کا دعویٰ کرنے والے کسی بھی فریق کی درخواست پر عدالت حکم دے سکتی ہے کہ اس رقم کی حکومت کی یا دُوسری منظور شدہ سیکورٹیز میں جسے وہ مناسب سمجھے سرمایہ کاری کر دی جائے اور وہ ہدایت دے سکتی ہے کہ اس سرمایہ کاری کا سود یا دُوسرے فوائد جمع ہونے دیئے جائیں اور وہ اس طرح ادا کئے جائیں جس طرح عدالت کے خیال میں متعلقہ فریقوں کو وہی یا اس کے قریب فائدہ حاصل ہو جو انہیں اس زمین سے حاصل ہوتا جس کے لئے یہ رقم جمع کرائی گئی تھی۔'' یہ دفعہ لینڈ ایکوئزیشن ایکٹ کی دفعہ 32 میں مذکورہ مقصد کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے جمع کرائی گئی رقم کا باقاعدہ انتظام کرنے کے بارے میں ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ عدالت میں جمع کرائی گئی ایسی رقم کی سرکاری یا منظورشدہ سیکورٹیز میں سرمایہ کاری کرائی جائے گی اور اس سرمایہ کاری کا سود یا فوائد ایسے شخص یا اشخاص کو ادا کئے جائیں گے جنہیں اس زمین پر ان کا حق ہونے کی بنیاد پر مستحق پایا جائے گا یا انہیں اس زمین سے فوائد حاصل کرنے کا حق دار پایا جائے گا، جس کے لئے کہ رقم جمع کرائی گئی تھی، شروع میں یہ دفعہ اس اس طرح تحریر کی گئی تھی:-

''34- معاوضے کی اس رقم پر سود کی ادائیگی جو زمین کا قبضہ لیتے وقت یا اس سے پہلے ادا نہیں کی گئی تھی یا جمع نہیں کرائی گئی تھی، کلکٹر مقرّر کردہ رقم مع 6 فیصد سالانہ کی شرح سے سود کے زمین پر قبضہ لینے کی تاریخ سے رقم کی ادائیگی تک کے عرصے کے لئے ادا کرے گا۔''

اس دفعہ میں ویسٹ پاکستان ایکٹ III 1969 کے ذریعے ترمیم کر کے ''چھ فیصد شرح سے اس پر سود'' کے الفاظ کو ''8 فیصد سالانہ سود مرکب'' سے بدل دیا گیا تھا اور اس میں ایک دفعہ کا اضافہ بھی کر دیا گیا جو فیصلے میں ان الفاظ میں پیش کی گئی ہے:-

''34- سود کی ادائیگی، جب زمین کا قبضہ لینے پر یا اس سے پہلے اس معاوضے کی ادائیگی نہیں کی گئی یا اسے جمع نہیں کرایا گیا تو کلکٹر مقرر کردہ رقم مع 8 فیصد سالانہ مرکب سود کے قبضہ لینے کے وقت سے رقم ادا ہونے یا جمع ہونے کے وقت تک کے عرصے کے لئے ادا کرے گا۔''

جہاں تک صوبے بلوچستان میں اس کے نافذ ہونے کا تعلق ہے، 1985 کے ایکٹ X III (سیکشن 11) کے ذریعے دفعہ 34 کو لینڈ ایکوزیشن ایکٹ سے بالکل ہی خارج کردیا گیا۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دفعہ 34 میں یہ دونوں ترامیم صوبہ سندھ میں لینڈ ایکوزیشن ایکٹ (ویسٹ پاکستان امینڈمینٹ) (اپیل) آرڈیننس 1971 (آرڈیننس VI آف 1971) کے ذریعے قابلِ نفاذ نہیں رکھے گئے۔ جہاں تک صوبہ سرحد کا تعلق ہے، نارتھ ویسٹ فرنٹیر آرڈیننس V 1983 کے ذریعے لینڈ ایکوزیشن ایکٹ 1894 میں دفعہ 34 کی جگہ مندرجہ ذیل دفعہ رکھی گئی ہے:-

''جب ایسے معاوضے کی رقم زمین کا قبضہ لیتے وقت یا اس سے پہلے نہ جمع کروائی گئی ہو اور نہ ہی ادا کی گئی ہو، تو کلکٹر عدالت کی طرف سے مقرر کی ہوئی رقم مع 6 فیصد سالانہ سادہ سود کے، قبضہ لینے کے وقت سے اس وقت کے عرصے تک کے لئے جب رقم ادا کی گئی ہو یا جمع کرائی گئی ہو، ادا کرے گا۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وفاقی شریعت عدالت کے لائق ججوں کے سامنے سیکشن 34 کی ترمیم شدہ اور چاروں صوبوں میں نافذ دفعات پیش کرکے ان کی مناسب مدد نہیں کی گئی، یہ ترمیم شدہ دفعہ پشاور ہائی کورٹ اور لاہور ہائی کورٹ کے سامنے زیرِ غور آئی تھی۔ شمالی مغربی سرحدی صوبے کی حکومت بذریعہ کلکٹر، لینڈ ایکوزیشن، نوشہرہ بنام محمد شریف خان (پی ایل ڈی 1975 پشاور 161) کے مقدمے میں پشاور ہائی کورٹ کے لائق ججوں نے فیصلہ دیا کہ معاوضے کی رقم میں وہ رقم بھی

شامل ہوتی ہے جو زبردستی زمین لینے کا سود کی شکل میں معاوضہ ہوتی ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور بذریعہ وائس چانسلر بنام خادم حسین اور 5 دُوسرے افراد کے مقدمے ...... (1990 ایم ایل ڈی 2158 لاہور) میں لاہور ہائی کورٹ کے لائق ججوں نے فیصلہ دیا کہ دفعات 28 اور 34 کے تحت سود وصول کرنے کا حق اصل میں ایکٹ کے تحت زبردستی زمین لینے کی کاروائی کے نتیجے میں زمین سے محرومی کا معاوضہ ہے، اور نہ ہی زمین سے زبردستی محروم کئے جانے کی وجہ سے مالک کے لئے معاوضہ کے علاوہ رقم ہے، یہ اصل میں مساوی معاوضہ دینے کی کوشش ہے یا مساوی قیمت کا متبادل ہے، درحقیقت یہ وہ معاوضہ ہے جس سے نقصان اُٹھانے والا فریق اپنی پہلی حیثیت پر واپس آجاتا ہے۔ اس دُوسرے مقدمے کا زیرِ بحث فیصلے میں نوٹس لیا گیا ہے۔

یہ ایکٹ جس کا فیصلے میں بھی ذکر آیا ہے، پہلی بار اسلامی نظریاتی کونسل کے سامنے اس کے اجلاس منعقدہ 19 جنوری 1976ء میں زیرِ غور آیا اور کونسل نے مندرجہ ذیل رائے دی:-

”قانونِ ہٰذا کے تحت حکومت کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ معاوضہ ادا کرنے کے بعد مفادِ عامہ کے لئے ایسی اراضی حاصل کرسکتی ہے جو نجی ملکیت میں ہو، نیز اس قانون میں سودی معاملات کا بھی ذکر ہے۔ کونسل کی یہ رائے دی کہ حکومت کو حصولِ اراضی کا ایسا اختیار حاصل ہے اور قرآن و سنت کا کوئی حکم اس میں مانع نہیں، نیز رِبا کے ضمن میں کونسل جو سفارش کرے گی وہ ان تمام قوانین کو متأثر کرے گی جن میں سود کا ذکر ہو، چنانچہ طے پایا کہ اس قانون میں کوئی چیز قرآن و سنت کے اَحکام سے متصادم نہیں ہے، البتہ سود سے متعلق دفعات رِبا کے مسئلے پر کونسل کی سفارش کے تابع ہوں گی۔“

یہ اسلامی نظریاتی کونسل کے سامنے 14-3-1982 کو بھی آیا جب جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن چیئرمین تھے، انہوں نے ان دفعات کے بارے میں مندرجہ ذیل

رائے کا اظہار کیا:۔

''زمین کا حصول زمین کے مالک یا ان لوگوں کو جن کا اس میں حق ہے معاوضہ ادا کرنے کے بدلے میں ہے۔ اس سلسلے میں کئے جانے والے مختلف اقدامات پراسیجر کے متعلق ہیں اور اسلامی قانون کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے، سود کے بارے میں دفعات جو سیکشن28، 32 اور 34 میں دی گئی ہیں، شریعت سے متصادم ہیں۔'' زیرِ بحث فیصلے میں یہ بھی نوٹ کیا گیا ہے کہ اسلامک آئیڈیولوجی کونسل نے متذکرہ بالا رائے سے اتفاق کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ لینڈ ایکوزیشن ایکٹ میں اس کے مطابق ترمیم کی جائے۔ یہ ایکٹ (لینڈ ایکوزیشن ایکٹ) ایس ایس ایم نمبر 14/1938.P میں وفاقی شریعت کورٹ کے زیرِ غور بھی آیا اور اس نے 27-3-1984 کو اس کے بارے میں فیصلہ دیا، لیکن سپریم کورٹ کی شریعت بنچ نے شریعت اپیل نمبر22 آف 1984 میں اس فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا۔ اس عدالت کے فیصلے مؤرخہ 13-1-1988 کے حوالے سے اس معاملے کو وفاقی شریعت کورٹ میں نئے فیصلے کے لئے دوبارہ پیش کیا گیا، ریمانڈ کا معاملہ وفاقی شریعت کورٹ کی فل بنچ کے سامنے مختلف تاریخوں میں پیش ہوا اور یہ ملتوی ہوتا رہا اور یہ اس وقت بھی التواء میں تھا جب وفاقی شریعت کورٹ کے تین لائق ججوں نے زیرِ بحث فیصلہ دیا۔ یہ نوٹ کرنا بھی ضروری ہے کہ وفاق کے وکیل کا یہ موقف کہ لینڈ ایکوزیشن ایکٹ کی دفعات28 اور 34 کے تحت دِلوائی جانے والی رقم اس معاوضے کی نمائندگی کرتی ہے جو زبردستی زمین حاصل کرنے کے طریقۂ کار کی وجہ سے زمین سے محرومی کی بنا پر دیا جاتا ہے، اس لئے اسے قرآن شریف میں اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں قرار دیا جانے والا ربا نہ سمجھا جائے۔ اس موقف کی حمایت میں انہوں نے لاہور ہائی کورٹ کا فیصلہ (1990 ایم ایل ڈی 2158) بھی پیش کیا، اس سلسلے میں الہ آباد، پٹنہ اور مدراس کی ہائی کورٹوں کے تقسیم سے پہلے کے فیصلوں کا نوٹس

بھی لیا گیا۔ وفاقی شریعت کورٹ کے لائق ججوں نے ان فیصلوں کا جائزہ لیا اور بہاری لعل کے مقدمے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ فیصلہ کرنے میں کہ سود یا معاوضہ انکم ٹیکس ایکٹ کے تحت کیا قابلِ ٹیکس آمدنی میں شامل ہوسکتا ہے عدالتیں جن عوامل کو اہمیت دیتی ہیں وہ اس معیار سے مختلف ہیں جو یہ دیکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ سیکشن 28 اور 34 کے تحت ادا کیا جانے والا سود ربا ہے۔ اس لئے یہ بات مناسب ہوگی کہ ہم جو ٹیسٹ یہ معلوم کرنے کے لئے کر رہے ہیں کوئی آمدنی انکم ٹیکس ایکٹ کے تحت آمدنی ہے اسی سے یہ معلوم کریں کہ یہ رِبا ہے یا نہیں؟ کسی رقم کے ربا ہونے کا صحیح ٹیسٹ قرآن شریف، رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ذریعے کیا جاسکتا ہے یا اسلامی قانون اور شریعت کے ماہر علماء اور فقہاء کی رائے سے کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے دفعات 28 اور 34 کے تحت ادا کئے جانے والے سود کو ربا کے علاوہ کچھ اور ثابت کرنے کے فیصلے کے حق میں دیئے گئے دلائل کے طریقۂ کار کو شریعت میں دُرست کہنا مشکل ہے۔ سیکشن 28 اور 34 کے تحت معاوضے کی شکل میں ادا کئے جانے والے قرضے پر سود میں اضافہ رِبا کے زمرے میں آتا ہے۔

جہاں تک لینڈ ایکوزیشن ایکٹ کی دفعہ 32 کا تعلق ہے، جس میں کلکٹر کی طرف سے جمع کرائی گئی معاوضے کی رقم کی زمین کی خریداری یا منظور شدہ سیکورٹیز میں سرمایہ کاری کے لئے کہا گیا ہے، یہ فیصلہ دیا گیا کہ مذکورہ سیکورٹیز بغیر سود والی ہوں۔ اس خیال سے کوئی اختلاف نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مالیاتی اداروں میں بغیر سود والی سیکورٹیز اور اسکیمیں بھی موجود ہیں، اور جب عدالتیں ہدایات دیں تو وہ سرمایہ کاری کو باقاعدہ بنانے کے لئے مالیات میں شریعت کے طریقوں کا خیال رکھیں۔

وفاقی شریعت کورٹ کے لائق ججوں نے اس عدالت کے قزلباش وقف وغیرہ بنام چیف لینڈ کمشنر پنجاب لاہور وغیرہ (پی ایل ڈی 1990 ایس سی 99) کے مقدمے میں اس بات کا نوٹس لیا کہ زبردستی زمین حاصل کرنے یا خریدنے کی تیسری

شرط یہ ہے کہ معاوضے کی ادائیگی یا تو قبضہ لینے سے پہلے کردی جائے یا اتنی مدّت میں کی جائے جسے تأخیر سے ادائیگی نہ کہا جاسکے، لیکن سیکشن 13 میں کہا گیا ہے کہ یہ ادائیگی سود والے بانڈز کے ذریعے کی جائے۔ اس حکم سے یہ اُصول اخذ کیا جاسکتا ہے کہ زمین کی ادا کی جانے والی قیمت نہ صرف یہ کہ کافی ہو اور اس کی قیمت کا صحیح اندازہ لگایا گیا ہو، بلکہ اس کی ادائیگی زمین کا قبضہ لیتے وقت فوراً کردی جائے، لیکن اگر فوری طور پر ادائیگی نہ کی جائے تو اس مناسب مدّت کے اندر کردی جائے جسے تأخیر سے ادائیگی نہ کہا جاسکے۔

غور طلب سوال یہ ہے کہ کیا لینڈ ایکوئزیشن ایکٹ کی دفعات 28 اور 34 اس اُصول پر منحصر ہیں۔ پشاور ہائی کورٹ کا فیصلہ اس اُصول پر منحصر ہے۔ پشاور ہائی کورٹ اور لاہور ہائی کورٹ نے متذکرہ بالا فیصلوں میں یہ نقطۂ نظر اپنایا ہے کہ عدالت کو ان دو دفعات کے تحت معاوضہ مقرّر کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے وہ زمین کے استعمال سے محروم کیے جانے کی وجہ سے ہے، اور قرآن شریف اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق رِبا کی تعریف میں نہیں آتا۔ زیرِ بحث مقدمے میں بھارت کے جن تین انکم ٹیکس کے مقدمات کا نوٹس لیا گیا ہے، ان میں بھی فیصلہ دیا گیا ہے کہ سود کی وصول کی جانے والی رقم معاوضہ ہے اور اس نقصان کی تلافی ہے جو جائیداد پر قبضہ رکھنے کے حق سے محرومی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے مقدمے، بہاری لعل بھارگو بنام یوپی اور سی پی انکم ٹیکس کمشنر (اے آئی آر 1941 الٰہ آباد 135) میں فیصلہ دیا گیا کہ لینڈ ایکوئزیشن ایکٹ کی دفعہ 35 کو اس طرح کے نقصانات کو سود کے حساب سے جانچنے کے آسان طریقے کے طور پر بنایا گیا ہے۔ پٹنہ ہائی کورٹ کے مقدمے، کمشنر آف انکم ٹیکس بہار اور اڑیسہ بنام رانی پریاگ کماری دیبی اے آئی آر 1939 پٹنہ 662 میں فیصلہ دیا گیا کہ معاوضے (Damages) کے طور پر موصول ہونے والی آمدنی کو انکم ٹیکس ایکٹ 1922 کے تحت قابلِ تشخیص آمدنی میں

شامل نہیں کیا جائے گا، اگرچہ یہ اس نتیجے پر پہنچی کہ مخصوص مقدمات میں یہ بات کہ یہ رقم آمدنی نہیں ہوتی بلکہ ایسی رقم ہوتی ہے جو جائیداد کو روکنے کے بدلے میں موصول ہوتی ہے، قابلِ قبول نہیں ہے۔ مدراس ہائی کورٹ کے مقدمے ریوینیو ڈویژنل آفیسر ترچنا پلی بنام وینکٹا رام ایا، میں اور ایک اور مقدمے اے آئی آر 1936 مدراس199 میں جس کا وفاقی شریعت کورٹ کے فیصلے میں غلط طور پر اے آئی آر 193 مدراس 199 حوالہ دیا گیا ہے، یہ فیصلہ دیا گیا کہ سیکشن34 کے تحت سود وصول کرنے کے حق نے قبضہ قائم رکھنے کے حق کی جگہ لے لی ہے، اور یہ ہی لینڈ ایکوزیشن ایکٹ کی بنیاد ہے کہ جب معاوضہ ادا کیا جانا تھا اور ادا نہیں کیا گیا تو عدمِ ادائیگی کی وجہ سے سود قبضے کی تاریخ سے ادا کیا جائے۔

وفاقی شریعت کورٹ کے لائق جج نے زیرِ بحث مقدمے میں متذکرہ بالا دلائل اس وجہ سے قبول نہیں کئے کہ یہ نہایت نامناسب ہے کہ جو ٹیسٹ معلوم کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ کیا کوئی رقم انکم ٹیکس ایکٹ کے تحت آمدنی ہے اس ٹیسٹ کو یہ معلوم کرنے کے لئے استعمال کیا جائے کہ کوئی رقم رِبا ہے یا نہیں، اس کا اصل ٹیسٹ وہ ہے جو قرآن شریف اور سنتِ رسولؐ میں دیا گیا ہے، فیصلے میں کہا گیا کہ سیکشن28 اور 34 کے تحت معاوضے کی شکل میں ادا کئے جانے والے قرضے میں سود کی شکل میں اضافہ رِبا کے زمرے میں آتا ہے، ان دونوں دفعات کے تحت معاوضے کی ادائیگی کی نوعیت اور اس کا مقصد ہمارے خیال کے مطابق مزید غور کا متقاضی ہے۔ الٰہ آباد کے مقدمے اے آئی آر 1941 الٰہ آباد135 میں دیئے گئے دلائل جو مدراس کے مقدمے اے آئی آر 1936 مدراس199 کی بنیاد بھی ہیں، ڈاکٹر شام لعل نرولا بنام کمشنر آف انکم ٹیکس پنجاب، جموں اور کشمیر، ہماچل پردیش اور پٹیالہ اے آئی آر 1964 ایس سی 1876 کے مقدمے میں سپریم کورٹ آف انڈیا کے زیرِ غور آئے اور ان کو قبول نہیں کیا گیا، اس بارے میں سپریم کورٹ آف انڈیا کی بتائی ہوئی وجہ

مندرجہ ذیل ہے:-

''لینڈ ایکوئزیشن ایکٹ کی دفعہ 34 معاوضے کے طور پر اوارڈ کی گئی رقم اور اس رقم پر واجب الادا سود کے درمیان خود امتیاز کرتی ہے، اوارڈ کی گئی رقم پر یہ سود اس وقت سے ادا کیا جاتا ہے جب سے کلکٹر نے قبضہ لیا ہے اور اس وقت تک ادا کرنا ہے جب رقم ادا یا جمع کی گئی ہو۔ دفعہ 23 کے مندرجات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دیئے گئے کسی بھی معاملے کے معاوضے میں سود شامل نہیں ہے اور نہ ہی اسے زمین حاصل کرنے کا معاوضہ کہا گیا ہے۔ سیکشن 23 کی کلاز (2) میں قانون سازوں نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ زمین پر لازمی طور پر قبضے کی نوعیت کا خیال کرتے ہوئے عدالت زمین کی مارکیٹ ویلیو کے علاوہ مارکیٹ ویلیو پر مزید 15 فیصد رقم ادا کرائے گی۔ اگر سیکشن 23 کے تحت معاوضے پر ادا کئے جانے والے سود کو معاوضے کا حصہ سمجھا جاتا یا یہ زمین حاصل کرنے کی لازمی نوعیت کا خیال کرتے ہوئے دیا جاتا تو قانون بنانے والے اس کا سیکشن 23 میں ہی ذکر کرتے، لیکن اس کے بجائے سود کی ادائیگی کا ذکر علیحدہ طور پر ایکٹ کی سیکشن 34 پارٹ V میں کیا گیا ہے۔ ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ سود کا تعلق معاوضے کی رقم مقرر ہوجانے کے بعد ادائیگی سے ہے، یہ یا تو ایسا معاوضہ ہے جو رقم کے استعمال کے بدلے میں ادا کیا جاتا ہے یا رقم واجب الادا ہوجانے کے بعد اس کی واپسی کا مطالبہ نہ کرنے کے بدلے میں دیا جاتا ہے۔ اس لئے ایکٹ میں خود حاصل شدہ زمین کے قابلِ ادائیگی معاوضے اور اوارڈ کئے ہوئے معاوضے پر قابلِ ادائیگی سود کے درمیان امتیاز کیا ہے۔

سپریم کورٹ آف انڈیا نے اے آئی آر 1970 ایس سی 1702 اور اے آئی آر 1972 ایس سی 260 میں اس فیصلے کی پیروی کی ہے۔ وفاقی شریعت کورٹ کے لائق ججوں نے یہ صحیح طور پر کہا ہے کہ یہ معلوم کرنے کا ٹیسٹ کہ کوئی رقم انکم ٹیکس ایکٹ کے تحت آمدنی ہے کہ نہیں، یہ معلوم کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ رقم ربا

ہے یا نہیں۔ اس سوال کا جواب جیسا کہ زیرِ بحث فیصلے میں بھی کیا گیا ہے، اسلامی قانون اور شریعت کے ماہر علماء اور فقہاء کے اخذ کئے ہوئے اُصولوں کی بنیاد پر دیا جاسکتا ہے۔ پہلا اُصول یہ ہے کہ لازمی طور پر حاصل کی جانے والی زمین کے سلسلے میں اس کا معاوضہ یا جائیداد اور زمین کی قیمت یا تو قبضہ لینے سے پہلے یا قبضہ لینے کے ساتھ ہی ادا کردی جائے یا اتنی مدت میں ادا کردی جائے کہ اسے ادائیگی میں قابلِ ذکر تاخیر نہ کہا جائے، لیکن اگر کوئی تاخیر ہوتی ہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ زمین کی ملکیت کا اس حد تک مفاد مستقل نہیں کیا گیا یہ اس لئے کیا جائے گا کہ متبادل قدر کے مطابق واجب قیمت کی ادائیگی کی ضرورت پر زور دیا جاسکے، اسی وجہ سے لینڈ ایکوزیشن ایکٹ کی سیکشن 28 میں ایسی رقم اوارڈ کرنے کے لئے کہا گیا ہے جو کلکٹر نے کم ادا کی ہو، کم تشخیص کی ہو یا کم مقرر کی ہو۔

شریعت کے نقطۂ نظر سے ایکوزیشن مالک سے جائیداد کی لازمی خریداری ہے اور اس کو دیا جانے والا معاوضہ ایسی خریداری کی قیمت ہے۔ جائز ایکوزیشن کی ضروری شرائط میں سے ایک شرط جیسا کہ اس عدالت نے قزلباش وقف V چیف لینڈ کمشنر پی ایل ڈی 1990 ایس سی 283 میں تحریر کیا ہے، یہ ہے کہ مالک کو قبضہ لیتے وقت یا اس سے پہلے زمین کی ایک اچھی مارکیٹ پرائس ادا کی جائے، اگر کلکٹر نے اچھی مارکیٹ پرائس سے کم قیمت ادا کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے مالک کو مجبور کیا ہے کہ وہ نہ صرف کم قیمت پر اپنی زمین حوالے کردے بلکہ مقدمہ بازی کی مشکلات کا بھی مقابلے کرے۔ اس مقدمے میں عدالت کا کام یہ ہے کہ وہ ایک اچھی قیمت مقرّر کردے۔ اپنا فرض ادا کرتے ہوئے عدالت جائیداد کے مالک کے ساتھ کی جانے والی ناانصافی اور اسے پیش آنے والی مشکلات کا خیال کرسکتی ہے اور قیمت بڑھاسکتی ہے تاکہ یہ مارکیٹ پرائس سے زیادہ ہوجائے، بجائے یہ آسان طریقہ اختیار کرنے کے 1894 کی سیکشن 28 نے پہلے زمین کی قیمت مقرّر کی اس میں اضافے کا

ذکر بھی کیا اور اس کے بعد اس پر 6 فیصد سالانہ کی شرح سے سود کے نام سے مزید رقم وصول کرنے کی اجازت بھی دی۔ یہی وجہ ہے کہ وفاقی شریعت کورٹ نے اسے اسلامی اُحکام سے متصادم قرار دیا کیونکہ ایک دفعہ قیمت مقرّر کردی گئی اور یہ قرض ہوگئی تو اس میں شرح فیصد کے حساب سے کوئی بھی اضافہ سود ہوا جو ممنوع ہے۔ اس کے برعکس اگر متذکرہ بالا وجوہ کی بنا پر قیمت میں مزید اضافہ کردیا جائے تو یہ سود نہیں ہوگا کیونکہ کسی چیز کی قیمت بہت سے عوامل کا خیال کرتے ہوئے مقرّر کی جاتی ہے جس میں اس پریشانی کا خیال بھی شامل ہوسکتا ہے جو اس سودے میں مالک نے خریدار کے ہاتھوں اُٹھائی ہے۔

اس لئے معاوضے کا اوارڈ دراصل سیکشن 28 کے تحت اختیار کیا جانے والا طریقۂ کار اسی طرح پنجاب، سندھ اور شمالی مغربی صوبے کے لئے مہیا کیا جانے والا طریقۂ کار شریعت کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہے، یہ سیکشن بلوچستان میں 1985 کے ایکٹ 13 کی سیکشن 9-A کے نام سے بنائی گئی ہے اور اس میں بھی مناسب اور کافی معاوضہ ادا کرنے کے لئے جائز اور مناسب طریقۂ کار مہیا نہیں کیا گیا۔ ان دفعات کو مندرجہ ذیل طرح کی دفعہ سے تبدیل کردیا جائے گا:۔

''سیکشن 4 کے تحت جاری ہونے والے نوٹیفکیشن کی تاریخ پر موجود مارکیٹ پرائس کی بنیاد پر مقرّر کئے جانے والے معاوضے کے علاوہ مقرّر کردہ معاوضے پر 15 فیصد سالانہ کی شرح سے (یا وقتاً فوقتاً مقرّر کی جانے والی شرح سے) مزید رقم معاوضے میں شامل کردی جائے گی اور یہ رقم سیکشن 4 کے تحت جاری ہونے والے نوٹیفکیشن کی تاریخ سے معاوضے کی حتمی ادائیگی تک کی مدّت کے لئے ادا کی جائے گی۔

جہاں تک سیکشن 34 کا سوال ہے، اوارڈ کی جانے والی رقم کو انڈین سپریم کورٹ نے بجا طور پر اپنے فیصلوں میں ایسا معاوضہ نہیں کہا جو مالک کو اس کی زمین کی ملکیت کے حق سے محروم کرنے کی وجہ سے دیا گیا ہے بلکہ اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ وہ اس رقم

کے استعمال سے محروم رہا جو اسے حاصل کی گئی زمین کے معاوضے کے طور پر ملی تھی اور اس لئے یہ معاوضے کی رقم تاخیر سے ادا کیے جانے پر ادا کیا جانے والا سود ہے۔

سیکشن 28 کی طرح اس سیکشن میں بھی استعمال کی جانے والی زبان اور پہلے اوارڈ کی جانے والی رقم پر مزید رقم کے اضافے کے لئے استعمال کیا جانے والے طریقہ کار کے بارے میں وفاقی شریعت کورٹ کی رائے حق بجانب ہے، لیکن اس اضافی رقم کی نوعیت کا صحیح طور پر تجزیہ کرتے ہوئے ہمیں یہ بات نظرانداز نہیں کرنی چاہئے کہ زمین کا مالک اپنی زمین کی جائز ملکیت سے بغیر کسی معاوضے کے محروم کر دیا گیا ہے، جیسا کہ ہم سیکشن 28 کے بارے میں اپنی بحث میں پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں، شریعت کی نظر میں ایکوئزیشن حکومت کی طرف سے لازمی خریداری ہے، ایسی لازمی خریداری کے لئے جائز ہونے کی بنیادی شرائط میں سے ایک شرط جس کے بارے میں اس عدالت نے قزلباش وقف بنام لینڈ کمشنر پی ایل ڈی 1990 ایس سی 283 کے مقدمے میں فیصلہ دیا ہے، یہ ہے کہ مالک کو قبضے کے فوراً بعد یا قبضہ لیتے وقت ایک اچھی مارکیٹ پرائس ادا کی جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایکوئزیشن کے معاملے میں جائز فروخت اس وقت ہی ہو سکتی ہے جب حکومت زمین کے مالک کو حقیقتاً قیمت ادا کر دے۔ ایکوئزیشن کے معاملے میں بغیر قیمت ادا کیے زمین کا قبضہ لے لینا جائز فروخت کے مترادف نہیں ہے۔ زمین کے مالک کو اس لئے یہ حق حاصل ہے کہ وہ زمین کے قبضے کے وقت سے لے کر اوارڈ کی ہوئی قیمت کی ادائیگی کے وقت تک کی مدت کا کرایہ لینے کا دعویٰ کرے کیونکہ اس وقت ہی جائز فروخت حقیقتاً عمل میں آئے گی، یہ کرایہ اس مدت میں مارکیٹ کے اچھے کرائے سے کم نہیں ہونا چاہئے۔

سیکشن 34 میں پہلی غلطی تو لفظ ''سود'' کا غلط استعمال ہے، دوسرے حاصل کی ہوئی جائیداد کے کرایہ کی قدر کا خیال کیے بغیر 8 فیصد سالانہ کی شرح مقرر کرنا بھی غلط ہے، یہ بات بھی یاد رکھی جائے کہ زمین کے مالک کو اچھا کرایہ ادا کیا جائے گا یا

اوارڈ شدہ رقم پر قبضے کے وقت سے معاوضے ادا ہونے تک 8 فیصد سالانہ ادا کیا جائے گا، دونوں میں سے جو رقم بھی زیادہ ہو۔ ان خیالات کے اظہار اور متذکرہ بالا ہدایت کے ساتھ لینڈ ایکوزیشن ایکٹ 1894 کے بارے میں وفاقی شریعت کورٹ کا فیصلہ برقرار رکھا جاتا ہے۔

V-کوڈ آف سول پرا سیجر 1908

سول پرا سیجر کوڈ کی جن دفعات میں سود کا لفظ آتا ہے، وہ زیرِ بحث فیصلے میں پیراگراف 297 سے 311 تک میں زیرِ بحث آئی ہیں۔ پیراگراف 304 میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ سود، مارک اَپ، لیز، ہائر پرچیز اور سروس چارج کے سلسلے میں نگوشی ایبل انسٹرومنٹس ایکٹ 1881 کی دفعات کا جائزہ لیتے ہوئے شریعت کی حیثیت کو بھی زیرِ غور لایا گیا ہے، اور سول پرا سیجر کوڈ کی دفعات پر بھی وہی خیالات عائد ہوتے ہیں، سول پرا سیجر کوڈ کی دفعات (1) 34 اور 27، (1) 34A اور (2) اور (a) (1) 34B کو سود کے ناجائز ہونے کے سوال پر بحث کے بعد اسلامی اَحکام سے متصادم قرار دیا گیا۔

سیکشن 34 میں کہا گیا ہے کہ جب ادائیگی کے لئے ڈگری جاری کی جائے تو عدالت ڈگری میں یہ حکم بھی دے سکتی ہے کہ اصل زر کی رقم پر اس شرح سے جو عدالت مناسب خیال کرتی ہے مقدمے کی تاریخ سے ڈگری جاری ہونے کی تاریخ تک سود ادا کیا جائے، یہ رقم اس سود کے علاوہ ہوگی جو مقدمہ شروع ہونے سے پہلے کسی رقم پر کسی بھی مدّت کے لئے واجب ہو۔ اس کے علاوہ فیصلہ کی گئی کل رقم پر اس شرح سے جو عدالت مناسب سمجھے ڈگری کی تاریخ سے رقم کی ادائیگی تک کی مدّت کے لئے وہ مزید سود ادا کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔

سیکشن 34A، آرڈیننس X 1980 کے ذریعہ نیا اضافہ ہوا ہے۔ یہ سرکاری قرضوں پر سود کے بارے میں ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ جب عدالت کی یہ رائے ہو کہ کوئی مقدمہ سرکاری قرضے پر اس سود کی ادائیگی سے بچنے کے لئے دائر کیا گیا ہے

جو مدعی کو یا اس کی طرف سے ادا کیا جاتا تھا تو عدالت اس مقدمے کو خارج کر سکتی ہے اور سرکاری واجبات پر بینک کی شرح سے مزید 2 فیصد سالانہ کی شرح سے سود ادا کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔

سیکشن 34A کی ذیلی دفعہ (2) ایک مختلف صورتِ حال کے بارے میں ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اگر عدالت کی رائے یہ ہو کہ مدعی سے سرکاری واجبات غلط وصول کئے گئے ہیں تو عدالت اس مقدمے کو نمٹاتے ہوئے حکم دے سکتی ہے کہ اس طرح وصول کی گئی رقم پر بینک کی شرح پر مزید 2 فیصد سالانہ سود وصول کیا جائے۔

سیکشن 34B کا 1980 کے آرڈیننس LXIII کے ذریعے نیا اضافہ کیا گیا ہے، اس کا تعلق بینکنگ کمپنی کے واجبات پر سود کے بارے میں ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جب بینک کے دیئے ہوئے قرضے کے واجبات کی ادائیگی کے لئے ڈگری جاری کی جارہی ہو تو عدالت اس قرضے کی نوعیت کے مطابق سود یا معاوضے کی ادائیگی کے لئے ڈگری تاریخ سے ادائیگی کے وقت تک کے سود یا معاوضے کی ادائیگی کا بھی ڈگری میں حکم دے گی۔ اس میں مزید کہا گیا ہے کہ سود والے قرضوں کے سلسلے میں عدالت معاہدے کی شرح کے مطابق یا بینک کی شرح سے 2 فیصد سالانہ زیادہ کی شرح سے جو بھی زیادہ ہو سود کی ادائیگی کے لئے ڈگری جاری کرے گی۔ اس سیکشن کی کلاز (b) میں کہا گیا ہے کہ جو قرضے مارک اَپ، لیز، ہائر پرچیز یا سروس چارجز کی بنیاد پر دیئے گئے ہیں اور ان کے کرایہ، مارک اَپ یا سرچارج کی شرح معاہدے میں دی گئی ہے تو حکومت اس کا سود یا معاوضہ معاہدے کی شرح کے مطابق یا بینک کی تازہ ترین شرح کے مطابق، دونوں میں سے جو زیادہ ہوگا ادا کرے گی۔

سیکشن 34B کی کلاز (c) میں کہا گیا ہے کہ نفع نقصان میں شراکت کی بنیاد پر دیئے جانے والے قرضوں کے معاملے میں معاوضہ اس شرح سے دیا جائے جو اس شرح سے کم نہ ہو جس پر بینک نے نفع نقصان کی بنیاد پر 6 ماہ کے لئے جمع کی ہوئی رقم

پر سالانہ شرح کی بنیاد پر گزشتہ چھ ماہ میں ادا کیا ہو۔ عدالت ایسے معاوضے کے لئے ڈگری میں اس شرح سے ادا کرنے کا حکم دے گی جو متذکرہ بالا چھ ماہ کے دوران نفع کی سالانہ شرح سے کم نہ ہو اور جسے عدالت اس مقدمے کے حالات کے مطابق منصفانہ اور مناسب خیال کرتی ہو۔

سیکشن34B کی کلاز (b) اور (c) کا تعلق ایسی رقم کی ادائیگی سے ہے جو کسی بینک نے کسی شخص کو مارک اَپ، لیزنگ، ہائر پرچیز، سروس چارج یا نفع نقصان کی شرح کی بنیاد پر دیا ہو لائق وفاقی شریعت عدالت نے ان دفعات کے بارے میں بھی اس ہی رائے کا اظہار کیا ہے جو اس نے نگوشی ایبل انسٹرومنٹس ایکٹ کی دفعات79 اور 80 کے بارے میں کیا تھا۔ ہم نے نگوشی ایبل انسٹرومنٹس ایکٹ کی دفعات79 اور 80 پر بحث کے دوران ان کی رائے کی خامیوں کو پہلے ہی بیان کردیا ہے۔ یہاں بھی ہمارا وہی تبصرہ ہے بلکہ زیادہ قوت کے ساتھ، کیونکہ ان دفعات کا مقصد گزشتہ ذمہ داریوں کی تکمیل زیادہ زور کے ساتھ کراتا ہے۔

اس کے نتیجے میں اس ایکٹ کی سیکشن 34B کی ذیلی دفعات (b) اور (c) اسلامی اَحکام سے متصادم قرار دی جاتی ہیں۔

سیکشن34 اور 34A کی دفعات عدالت کو ڈگری کی رقم کے علاوہ مزید رقم منظور کرنے کا اختیار بھی دیتی ہیں، اور جس رقم کے لئے اختیار دیا گیا ہے اس کا نام سود ہے، ہم پہلے ہی فیصلہ دے چکے ہیں کہ قرضے کی اصل زر کے اُوپر کوئی بھی رقم رِبا ہوتی ہے اور یہ ممنوع ہے۔ اس لئے ان دفعات میں بتائی گئی کوئی بھی اضافی رقم رِبا ہوگی۔ اس موقع پر یہ مناسب ہوگا کہ ماہرینِ معاشیات اور بینکرز کی طرف سے پیش کی گئی معروضات کا نوٹس لیا جائے، خاص طور پر محمد عمر چھاپرا اور شاہد صدیقی کی گزارشات کا جو کہتے ہیں کہ کوئی بھی معاشی نظام اور خاص طور پر اسلامی معاشی نظام اس وقت تک کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا جب تک کہ اس کے قرضہ دینے والے

ادارے، کارپوریٹ ادارے، فرمز اور افراد خود قرضوں کی ادائیگی وقتِ مقرّر کے اندر نہیں کرتے یا پھر ان سے قرضے یا مالی امداد مقررہ وقت کے اندر واپس نہیں کرائی جاتی، وہ کہتے ہیں کہ قانونی ذرائع اور عدالتوں کے ذریعے قرضے کی واپسی کے نظام کو اس طرح بنایا جائے کہ قرضوں کی واپسی ہفتوں میں ممکن ہوسکے۔ چھاپرا کا خیال تھا کہ اگر مقروض لوگ قرضوں کی واپسی کے شیڈول پر خود عمل درآمد نہیں کرتے یا قانون اور عدالتیں انہیں قرضے واپس کرنے پر مجبور نہیں کرتیں تو اسلامی فنانس کبھی ترقی نہیں کرسکتا، اور اسی لئے ضروری ہے کہ عدالتیں اسلامی معاشی نظام میں شامل اخلاقی پستی کا خیال رکھیں۔ شاہد صدیقی نے اپنے خطاب میں کہا کہ ایک مسلمان کو قرض آخری حد کے طور پر لینا چاہئے، کیونکہ اسلامی نظام میں مشارکہ، مضاربہ، نفع نقصان کی بنیاد پر شراکت جیسے نظام موجود ہیں، جن سے تجارت اور صنعت کو ترقی ہوسکتی ہے، انہوں نے مزید کہا کہ ان کارپوریشن کے پردے میں فراڈ کرنے اور ذمہ داریوں سے بچنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ کمپنی کے ایک علیحدہ اور آزاد شخصیت ہونے کے تصور کو ختم کیا جائے اور اس آزاد قانونی شخصیت بنانے والے لوگوں کو کسی بزنس کنسرن، کمپنی یا ادارے کے فیل ہونے کا ذمہ دار قرار دینا چاہئے اور فیزیبلٹی رپورٹس اور دُوسری دستاویزات میں جن کی بنیاد پر مالی امداد حاصل کی گئی تھی، غلط بیانی کرنے والے لوگوں کو بزنس کے ناکام ہونے کی صورت میں گرفت میں لیا جائے اور انہیں فراڈ اور غلط بیانی کرنے پر ملک کے قانون کے مطابق سزا دی جائے۔ انہوں نے دلیل دی کہ ثبوت دینے کی ذمہ داری اس شخص پر ڈالی جائے جو فیل ہونے والی کمپنی بناتا ہے، وہ ثابت کرے کہ اس نے فیزیبلٹی رپورٹ اور دُوسری دستاویزات میں جو باتیں بیان کی تھیں، وہ دُرست تھیں، اور یہ کہ کسی ایسے عوامل کی وجہ سے فیل ہوئی جو ان کے کنٹرول سے باہر تھے، ورنہ دُوسری صورت میں ایسے نادہندگان قومی دولت ہڑپ کرنے کے بعد ملک کے اندر اور باہر پھلتے پھولتے رہیں گے، جس طرح کہ

بینک اور دُوسرے مالیاتی اداروں کے موجودہ نادہندے خوش حال ہیں۔ مذہبی علماء اور ماہرینِ معاشیات ایسے قانونی طریقے مہیا کرسکتے ہیں جن کے ذریعے نادہندگان سے رقوم کی واپسی مؤثر طور پر مقررہ وقت پر ممکن ہوگی۔ انہوں نے بتایا کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص کی نماز میں شامل نہیں ہوتے تھے جو اپنا قرضہ ادا کئے بغیر انتقال کرگیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مرنے والے لوگوں کے قانونی ورثاء نمازِ جنازہ پر اعلان کرتے ہیں کہ اگر مرنے والے پر کسی کا قرضہ واجب ہوتو وہ باہر آئے اور دعویٰ کرے تاکہ اس کا قرضہ ادا کردیا جائے یا وہ اللہ تعالیٰ کے نام پر قرضہ معاف کردے۔ صاحبِ علم مسلمانوں کی نمازِ جنازہ پر ایسے اعلان کئے جاتے ہیں اور لوگ اپنی رقوم کے دعوے کرکے وصول بھی کرتے ہیں، وہ اپنا قرضہ یا کلیم اللہ کے نام پر معاف کردیتے ہیں تاکہ مرحوم کی رُوح کو سکون حاصل ہوسکے، لیکن ایسے اعلانات امیر طبقے کے ہاں کبھی نہیں دیکھے گئے، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ذاتی ذمہ داری اور کمپنی کی جو ایک قانونی شخصیت ہوتی ہے ذمہ داری کے درمیان فرق کرتے ہیں، حالانکہ اکثر مواقع پر وہ دستاویزات میں رقم واپس کرنے کے لئے ذاتی ضمانت بھی دیتے ہیں۔

یہ بات نوٹ کرنا بھی ضروری ہے کہ ہمارے قانونی نظام میں ڈگری حاصل کرنے والوں کی مشکلات میں اس وقت مزید اضافہ ہوجاتا ہے جب ڈگری پر عمل درآمد کرایا جاتا ہے۔ ڈگری حاصل کرنا ہی کوئی آسان کام نہیں، بہت سے چھوٹے اعتراض اور تاخیری حربے استعمال کئے جاتے ہیں تاکہ مقدمہ ختم نہ ہوسکے۔ مقدمے کے فریقوں کی طرف سے تاخیری حربے استعمال کرنے کے علاوہ عدالتوں میں کام کے بوجھ کی وجہ سے بھی مقدمات کا وقت پر اور جلدی فیصلہ ہونا ممکن نہیں ہوتا، ایک دن کے لئے جو مقدمات مقرر کئے جاتے ہیں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ افسر ایک مقدمے کو چند منٹ سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا، اس وجہ سے مقدمات ان وجوہات کی بنا پر برسوں چلتے رہتے ہیں۔

اس لئے سول پراسیجر کوڈ کی ان دفعات کو متذکرہ بالا پسِ منظر میں دیکھنا چاہئے، یہ قانونی سوال اس کے علاوہ ہے کہ ان دفعات کے تحت عدالت کو دیئے گئے اختیار کے تحت ڈگری کی رقم کے علاوہ جو مزید رقم منظور کی جاتی ہے، اگرچہ اسے سود کہا جاتا ہے، کیا وہ رِبا کے زمرے میں آتی ہے یا نہیں۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ قانون کے ذریعے عدالت کو مزید رقم منظور کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے اس کا اس معاہدے کے فریقین کسی عمل پر انحصار نہیں ہے۔ اور یہ کسی اضافی قیمت کا معاوضہ بھی نہیں ہے، بلکہ یہ اس رقم کی ادائیگی کی رسید ہے جس کی قانون اصل رقم کے علاوہ اجازت دیتا ہے، اس طرح اس رِبا کو وصول کرنے کی اجازت دی گئی ہے جو کسی قرضے کے معاہدے کے سلسلے میں ادا کیا جاتا ہے اور اسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ اگر اس دفعہ کے تحت عدالت کو اختیار دیا جائے کہ وہ قرضہ دینے والے کو جس کے حق میں ڈگری ہو رہی ہے اس نقصان کی تلافی کے لئے معاوضہ وصول کرنے کی اجازت دے جو اسے رقم کی واپسی کے سلسلے میں مقدمہ دائر کرنے کے بعد تاخیری حربے استعمال کرنے کی وجہ سے پہنچا ہے تو معاوضہ منظور کرنے کے اس طرح کے اختیار پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا، لیکن ایسی صورت میں ہر مقدمے میں ایک مقررہ شرح پر جو اس رقم کی قیمت کی بنیاد پر مقرر کی جائے گی معاوضہ منظور کیا جاسکتا ہے کیونکہ ہر مقدمے میں اس اختیار کو اس مقدمے کی کیفیت کے مطابق استعمال کیا جائے گا۔ قانون بنانے والے عدالت کو کسی ایسے فریق پر جرمانہ عائد کرنے کا اختیار بھی دے سکتے ہیں جو اپنا قرضہ ادا نہیں کرتا یا جو اذیت ناک بہانے کرنے اور تاخیری حربے استعمال کرنے کا مرتکب ہوا ہے، تاکہ مقدمے کا فیصلہ ہونے میں اور اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں تاخیر کرا سکے۔ اس جرمانے میں سے حالات کے مطابق چھوٹا حصہ یا بڑا حصہ تلافی کے طور پر اس فریق کو بھی دیا جاسکتا ہے جسے ان حربوں سے نقصان اور تکلیف پہنچی ہے۔ اس جرمانے کی رقم حکومت

وصول کرسکتی ہے اور اسے خیراتی مقاصد کے لئے اور عوامی مفاد کے ایسے پراجیکٹس کے لئے بھی استعمال کرسکتی ہے جو معاشرے کے ضرورت مند اور غریب لوگوں کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لئے قائم کئے جائیں۔

کورٹ آف سِوِل پروسیجر کی مندرجہ بالا دفعات قرآنِ کریم اور حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے منافی ہیں، اس لئے انہیں تعلیماتِ اسلام کے منافی قرار دیا جاتا ہے، ان دفعات میں اُوپر دی گئی آبزرویشنز کی روشنی میں مناسب ترامیم کی جائیں۔ اس فیصلے میں کوڈ آف سِوِل پروسیجر کی حسبِ ذیل دفعات پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے: (I) سیکشن 2 (12) (III) سیکشن 35(3)(III) سیکشن 144(1)(IV) آرڈر (XXI) رول 11 (2) (جی)(VI) آرڈر XXL رول 38 (IV) آرڈر XXL رول 79 (3) (VII) آرڈر XXI رول 80 (3) (VIII) آرڈر XXI رول 93(IX) آرڈر XXXIV رول 2 (1) (اے)(I)، (III)، (سی) (؟) اور (II) (X) آرڈر XXXIV رول 2 (2) (XI) آرڈر XXXIV رول 4(XII) آرڈر XXXIV رول 7(1) (اے) (I) اور (III) اور (سی)(I) اور (XIII)(II) آرڈر XXXIV رول 7(2) (XIV) آرڈر XXXIV رول II (XV) آرڈر XXXIV رول 13 (1) (XVI) آرڈر XXXVII رول 2(XVII) آرڈر XXXIX رول 9 ان دفعات میں بھی جہاں کہیں لفظ ''سود'' آتا ہے، اسے حذف کر دیا جائے گا اور اس کی جگہ کوئی دُوسرا مناسب لفظ درج کیا جائے گا۔ آرڈر XXXVIL، رول 2[2 (اے) اور (بی)] بھی نیگوشی ایبل انسٹرومنٹس ایکٹ 1881ء کی دفعات 79 اور 80 کی مانند ہیں اور ان کے بارے میں بھی ہماری وہی رائے ہے جو اس ایکٹ کا جائزہ لیتے وقت ہم نے ریکارڈ کی ہے۔ چنانچہ ان دونوں دفعات (یعنی سب رول (اے) اور (بی) آف رول 2، آرڈر XXXVII) کو تعلیماتِ اسلامی کے منافی قرار دیا جاتا ہے۔ کورٹ کے آرڈر XXI کے رول 79(3) میں کہا گیا ہے کہ ریکوری کی ڈگری جاری

ہونے کی صورت میں مدعا علیہ سے قابلِ وصول قرض کی دستاویز کو فروخت کر دیا جائے گا، عدالت اس قرض کے اصل دائن کو قرض وصول کرنے یا اس کا سود وصول کرنے سے روک دے گی اس طرح مدیون کو خریدار کے علاوہ کسی دُوسرے شخص کو ادائیگی کرنے سے بھی منع کر دے گی۔ اسی طرح کورٹ کے آرڈر XXL کا رول 80(3) بھی نیگوشی ایبل انسٹرومنٹ کو منتقل کرنے پر توجہ دیتا ہے، جس کا مقصد ریکوری ہے، یہاں پھر نامزد کردہ شخص کو سود وصول کرنے کی اجازت دی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ وفاقی شرعی عدالت نے اس کو قابلِ اعتراض دفعات میں شامل کیا ہے۔ بنابریں اُوپر درج کی گئی حد تک ان دفعات کے بارے میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھا جاتا ہے۔

VI - کوآپریٹو سوسائٹیز ایکٹ 1925

کوآپریٹو سوسائٹیز ایکٹ 1925 کی دفعہ 59(2) (ای) کے رول 14 (I) (ایچ)، رول 22 اور رول 41 کو ضمیمہ I تا IV کو اس فیصلے کے پیراگراف نمبر 312 تا 321 میں زیرِ بحث لایا گیا ہے اور اسے تعلیماتِ اسلامی کے منافی قرار دیا گیا ہے۔ (پی ایل ڈی 1992 ایف ایس سی I)۔ اسی طرح کوآپریٹو سوسائٹیز ایکٹ 1925 کی دفعہ 71(2) کلاز (ای ای) اور نیشنل انڈسٹریل کوآپریٹو فنانس کارپوریشن لمیٹڈ کے بائی لاء (3) کے سب بائی لاء (6) کے ان حصوں کو جن کا تعلق سود سے ہے، کو بھی تعلیماتِ اسلامی کے منافی قرار دے دیا گیا ہے۔ (پی ایل ڈی 1992 ایف ایس سی 537 اور پی ایل ڈی 1992 ایف ایس سی 535) ان دفعات میں لفظ ''سود'' کو اس بنیاد پر حذف کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ سود چارج کرنا، لاگو کرنا اور اس کی ریکوری کرنا تعلیماتِ اسلامی کے منافی ہے، چنانچہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو اس حد تک برقرار رکھا جاتا ہے۔

VIII - انشورنس ایکٹ 1938

انشورنس ایکٹ 1938 کی مندرجہ ذیل دفعات کو وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کیا گیا تھا، اور انہیں اس بنا پر کہ ان میں سود کی شرح، سودی رقم کی گارنٹی، سود کی اقساط میں ادائیگی اور سود کی دیگر شرائط درج تھیں، تعلیماتِ اسلامی کے منافی قرار دے دیا تھا، اس کا ذکر اس فیصلے کے پیراگراف نمبر 322 تا 324 میں کیا گیا ہے۔ پہلی دفعہ ''سود کی شرح'' کے الفاظ حذف کئے جاسکتے ہیں تا کہ اسے شریعت میں امتناع سود کے مقاصد سے ہم آہنگ کیا جاسکے۔ دفعہ 27 کی ذیلی دفعہ (3) سے لفظ ''سود'' حذف کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کا تعلق اس ملک کی حکومت کی پالیسیوں سے ہے جس کی کرنسی کا اصل زَر، گارنٹی اور سود کی ضمانتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا تعلق غیرملکی حکومت کے اصل زَر اور اس کی ضمانتوں سے ہے۔ تاہم انشورنس کرنے والا جب اس رقم کی سرمایہ کاری کرے تو پھر متعلقہ دفعات کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ فیصلے میں اس پہلو کا نوٹس نہیں لیا گیا تھا اور صرف لفظ ''سود'' کو حذف کرنے کی ہدایت کی گئی تھی، دیگر دفعات میں موجود لفظ ''سود'' کو حذف کرکے اس کی جگہ ایسے ترمیم شدہ الفاظ لائے جائیں جو قانون کے مقاصد اور پالیسی کی ضروریات اور اس فیصلے میں ظاہر کئے گئے خطوط کے تقاضوں کو پورا کریں۔ ان اقدامات کا مقصد معاشرے کی معیشت سے رِبا کو اس طریقے سے ختم کرنا ہونا چاہئے کہ اس سے اقتصادری سرگرمیاں متاثر نہ ہوں، اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے کہ معیشت ترقی کی راہ پر گامزن رہے، مزید براں یہ پہلو بھی پیشِ نظر رہے کہ یہ سب کچھ شفاف انداز سے ہو اور تمام فرائض و ذمہ داریاں بھی پوری ہوتی رہیں، اس مرحلے پر اس پہلو کا جائزہ لینا کہ آیا انشورنس کا کاروبار اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے یا نہیں؟ ایک مختلف سوال ہے، جو زیرِ سماعت اپیلوں میں زیرِ بحث نہیں لایا گیا۔

VIII - اسٹیٹ بینک آف پاکستان ایکٹ 1956

اسٹیٹ بینک آف پاکستان ایکٹ 1956 کی دفعہ 22(1) کا اس فیصلے کے پیراگراف نمبر 325 تا 328 میں جائزہ لیا گیا ہے۔ وفاقی شرعی عدالت نے سود کی بنیاد پر کمرشل دستاویزات جیسے تمسکات اور بانڈز کی طرح کے بلز کی خریداری کو اسلامی تعلیمات کے منافی قرار دیا تھا۔ وفاقی شرعی عدالت کی اس رائے کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی مالیاتی دستاویزات اور انسٹرومنٹس کو ایسی شکل میں تبدیل کرنا ہوگا جو اسلام کے اقتصادی نظام سے ہم آہنگ ہوں۔ ہم یہ معاملہ ماہرینِ اقتصادیات اور بینکاروں کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں کہ وہ رِبا کی حرمت کے قرآن کے حکم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان معاملات کا عملی حل مرتب کریں۔

X - ویسٹ پاکستان منی لینڈرز آرڈیننس 1960

XI - ویسٹ پاکستان منی لینڈرز رولز 1965

XII - پنجاب منی لینڈرز آرڈیننس 1960

XIII - سندھ منی لینڈرز آرڈیننس 1960

XIV - سرحد منی لینڈرز آرڈیننس 1960

XV - بلوچستان منی لینڈرز آرڈیننس 1960

رقم اُدھار پر دینے اور اُدھار دینے والوں سے متعلق مندرجہ بالا قوانین کا اس فیصلے کے پیراگراف نمبر 329 تا 331 میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ان قوانین کے بارے میں صحیح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ ان کا اسلامی تعلیمات میں کوئی وجود نہیں اور نہ ہی اسلام کے سوشل جسٹس نظریے میں ان کا کوئی مقام ہے، اس لئے ان کا ملکی قوانین کی کتاب میں موجود ہونے کا کوئی جواز نہیں، اس لئے دُرست طور پر انہیں اسلامی تعلیمات کے منافی قرار دیا گیا ہے۔

XVI- ایگریکلچرل ڈویلپمنٹ بنک رولز1961

اس فیصلے کے پیراگراف نمبر322 سے 336 میں ایگریکلچرل ڈویلپمنٹ بینک رولز1961 اور اس کے سب رولز(1)، (2) اور (3) جن کا تعلق سود سے ہے، کا جائزہ لیا گیا ہے اور انہیں تعلیماتِ اسلامی کے منافی قرار دے کر انہیں حذف کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، شرعی امتناع کی روشنی میں سود لاگو کرنے، چارج کرنے اور اسے ریکور کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اس لئے ان رولز کو اس فیصلے میں دی گئی گائیڈ لائن کے مطابق تبدیل کیا جائے۔

XVII- بینکنگ کمپنیز آرڈیننس1962

وفاقی شرعی عدالت نے بینکنگ کمپنیز آرڈیننس1962 (جسے اس کے بعد بینکنگ آرڈیننس کہا جائے گا) کی دفعہ 25(2) کو سود اور مارک اَپ کی حد تک خلافِ اسلام قرار دیا تھا۔ اس دفعہ میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ بینکنگ کمپنیوں کو بعض ہدایات دے سکے، جن میں سود کی شرح، مارک اَپ کے چارجز کے بارے میں بھی ہدایات شامل ہیں۔ جن کا اطلاق پیشگی ادائیگیوں یا سود کی بنیاد پر کسی قرض لینے والے کو قرض دینے سے منع کرنے پر ہوتا ہے۔ جہاں تک اس دفعہ میں سود کا تعلق ہے وہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے اور اس پہلو پر پہلے ہی تفصیلی بحث کی جاچکی ہے۔ فاضل وفاقی شرعی عدالت نے بھی اس دفعہ سے لفظ ''مارک اَپ'' کو حذف کرنے کی ہدایت کی ہے۔ ہم نے بھی گزشتہ پیراگرافوں میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ آج کل جس طریقے سے ''مارک اَپ'' کا اطلاق کیا جارہا ہے وہ ربا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس لئے اسے روک دیا جائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی قرار دیا ہے کہ مارک اَپ کی بنیاد پر حقیقی فروخت کا نظریہ اپنی اصل میں ناجائز نہیں ہے، بشرطیکہ اس میں ان پہلوؤں کا لحاظ رکھا جائے جن کا مسٹر جسٹس محمد تقی عثمانی نے اپنے فیصلے کے پیراگراف نمبر 191 اور 219 میں ذکر کیا ہے۔ مارک اَپ کے تحت لین دین

کے جواز کی سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ یہ قرض دینے اور رقم کی پیشگی ادائیگی کی بنیاد پر وصول نہ کیا جائے، بلکہ یہ کسی چیز کی حقیقی فروخت کی بنیاد پر ہو اور اس ضمن میں اس کے تمام نتائج کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ مگر بینکنگ آرڈیننس کی دفعہ 9 بنک کو ٹریڈنگ سے روکتی ہے، اس دفعہ میں کہا گیا ہے کہ: ”سیکشن 7 کے تحت دیئے گئے اختیارات کے سوا کوئی بینکنگ کمپنی براہِ راست یا بالواسطہ خریداری یا فروخت یا چیزوں کے بدلے چیزوں کے لین دین یا کسی تجارت یا خرید و فروخت یا چیزوں کی بارٹر یا اسی طرح کی دیگر سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہوگی، اور وہ ایکسچینج بلوں کو وصول کرنے یا ان کے لین دین کے معاملے تک محدود رہے گی۔“

جب دفعہ 25 میں استعمال کئے گئے لفظ مارک اَپ کو دفعہ 9 کے مقابلے میں رکھ کر پڑھا جائے تو یہ یقینی طور پر اسلامی تعلیمات کے منافی قرار پایا ہے، کیونکہ مارک اَپ کے تحت جائز لین دین کا تصور اشیاء کی حقیقی فروخت کے بغیر نہیں کیا جاسکتا جس کی بینک رولز میں اجازت نہیں، اس لئے مارک اَپ کی دفعہ اور سیکشن 9 میں بیان کی گئی صورتِ حال اکٹھے برقرار نہیں رہ سکتی اور ان دو میں سے کسی ایک کو ختم کرنا لازم ہوجاتا ہے۔

اس موقع پر ہمیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ مارک اَپ کی بنیاد پر فروخت مرابحہ اس کی ضروری شرائط کو پورا کرنے کے بعد ایک اسلامی بینک کے لئے آئیڈیل صورت اختیار نہیں کرسکتی، تاہم بینکوں کو بعض صورتوں میں لین دین کی اس شکل کو بھی اختیار کرنا ہوگا، خصوصاً جب موجودہ نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کیا جارہا ہوگا، اس صورتِ حال کی روشنی میں سیکشن 9 کو ختم کرنا زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے، بجائے اس کے کہ مارک اَپ کے تحت لین دین کو مکمل طور پر ممنوع قرار دے دیا جائے۔ علاوہ ازیں سیکشن 9 اسلامی بینکاری کا نظام قائم کرنے کے سلسلے میں بھی ایک بہت بڑی رُکاوٹ ہے، یہ سیکشن نہ صرف شریعت کے مطابق مرابحہ یا بیع المؤجل کے

لین دین میں رُکاوٹ بنتا ہے بلکہ یہ لیزنگ، اجارہ، خریداری، مشارکہ اور مضاربہ کے لین دین میں بھی رُکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ سیکشن 9 دراصل سودی بینکاری کے لئے وضع کی گئی تھی جس میں بینک صرف رقم اور کاغذات میں ڈیلنگ کرتے ہیں، اس کے برعکس حقیقی اسلامی مالیاتی لین دین ہمیشہ حقیقی اثاثوں کی بنیاد پر ہوتا ہے اور یہی اسلامی بینکاری کا امتیازی عنصر ہے جو معیشت کو سودی بینکاری سے نجات دِلاسکتا ہے، اور اس پر تفصیلی بحث پہلے کی جاچکی ہے۔ اسلامی بینکاری کا نظریہ اس وقت تک حقیقت کا رُوپ نہیں دھار سکتا جب تک اس بات کا شعور حاصل نہ کرلیا جائے کہ بینک صرف پیسے اور کاغذات کا کاروبار کرنے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ ان کی مالیاتی سرگرمیوں کا براہِ راست تعلق حقیقی کاروباری لین دین سے ہوتا ہے، اس لئے سود کا خاتمہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک بینکوں پر عائد بینکنگ آرڈیننس کی سیکشن 9 کو ختم نہ کردیا جائے۔ بنابریں ہمارا پختہ یقین ہے کہ سیکشن 25 میں موجود مارک اَپ کے نظریے پر صحیح طور پر منصفانہ انداز سے اور عملی فیصلہ اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک سیکشن 9 کی طرف سے عائد پابندی اُٹھا نہ لی جائے۔ اگرچہ فاضل وفاقی شرعی عدالت نے سیکشن 9 پر بحث نہیں کی، تاہم اس عدالت نے صوبہ پنجاب بنام امین جان نعیم اور چار دیگر نامی مقدمے کے فیصلے میں یہ اُصول وضع کردیا ہے: ''ہم نے متعدد مقدمات میں یہ قرار دیا ہے کہ جس قانون کو چیلنج کیا گیا ہے، اگر اس میں شامل معاملات کا منصفانہ اور صحیح حل اسی قانون کی دُوسری شق کو ختم کئے بغیر ممکن نہ ہو تو عدالت اس شق کو ختم کرنے کا اختیار رکھتی ہے، اس ضمن میں قزلباش وقف بنام لینڈ کمشنر پنجاب کے مقدمے کا حوالہ دیا جاسکتا ہے (پی ایل ڈی 1990 ایس سی 99 پیرا 187 تا 280) جس میں پنجاب ٹیننسی ایکٹ 1887 کی دفعہ 60اے کو پبلک کی طرف سے اپیل کئے بغیر ختم کردیا گیا ہے (پیرا 30)۔'' مذکورہ مقدمے میں جو اُصول وضع کیا گیا ہے اس کی روشنی میں ہمیں اطمینان ہے کہ بینکنگ آرڈیننس کی سیکشن 25

میں مارک اَپ کے بارے میں اس وقت تک منصفانہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا جب تک اس آرڈیننس کی سیکشن9 کو ختم نہ کردیا جائے۔ اس لئے قرار دیا جاتا ہے کہ سیکشن 25 میں لفظ مارک اَپ کو برقرار رکھا جائے، تاہم سیکشن 9 تعلیماتِ اسلامی کے منافی ہے کیونکہ اس کے ذریعے بینکوں کو اشیاء کی خریداری اور ان دُوسری تجارتی سرگرمیوں سے روک دیا گیا ہے جو بیع المؤجل اور مرابحہ جیسے اسلامی تجارت کے طریقوں کے لئے ضروری ہیں، اور یہ مارک اَپ، لیزنگ، ہائر پرچیز اور مشارکہ جیسی حقیقی تجارتی شکلوں پر مبنی ہیں، سیکشن9 کی جگہ اسلام کی وہ مالیاتی شقیں لیں گی جو حقیقی تجارت کی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ سب رول(2) کا تعلق غیرملکی منظورشدہ امانتوں سے ہے، جن پر سود کریڈٹ کیا جاتا ہے، جبکہ سب رول(3) روپے کی ضمانتوں کے پورا ہونے پر سود کریڈٹ کرنے سے متعلق ہے، اس فیصلے کے پیراگراف 342 میں واضح کیا گیا ہے کہ مفصل بحث کے بعد قرار دیا گیا ہے کہ رول9 کا سب رول(2) اور (3) کا تعلق کیونکہ سود سے ہے اس لئے یہ قرآنِ حکیم اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ طاہرہ کی رُو سے اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں، غیرملکی منظورشدہ ضمانتیں جو پہلے ہی پوری ہوچکی ہیں پر سود سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس طرح وصول ہونے والی رقوم بیت المال میں جمع کرائی جاسکتی ہیں اور ان سے غیرملکی قرضوں کی ادائیگی کے علاوہ دیگر ذمہ داریاں پوری کی جاسکتی ہیں، شریعتِ مطہرہ میں اس طرح کے عبوری اقدامات کی اجازت ہے، روپے کی ضمانتوں سے حاصل ہونے والی رقوم کا بھی یہی مصرف ہوسکتا ہے تاہم مستقبل میں ایسے لین دین کی اجازت نہیں دی جائے گی جس میں سود کا عمل دخل ہو۔

XIX- بنکس (نیشنلائزیشن پیمنٹ آف کمپنیشن رول 1974)

رول9 کا تعلق حصص کے حصول کی تاریخ سے سود کا حساب لگانے، اس کی سالانہ ادائیگی اور سود کی ادائیگی کے طریقِ کار سے ہے۔ ان اُمور کا جائزہ اس فیصلے کے پیراگراف نمبر 343 تا 350 میں لیا گیا ہے، جن میں قرار دیا گیا ہے کہ یہ رول

تعلیماتِ اسلامی کے منافی ہے کیونکہ اس کا تعلق سود کے حساب کتاب سے ہے، ہماری رائے یہ ہے کہ رول 9 کی مختلف کلازوں سے لفظ سود کو حذف کرنے کی بجائے ایک نیا رول وضع کیا جائے جو امتناعِ سود کی اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہو، تاہم حصص سے متعلق منافع کی واپسی کا انتظام شرعی اُصولوں کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

XX- بینکنگ کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈیننس 1979

اس فیصلے کے پیراگراف نمبر 351 تا 354 میں اس آرڈیننس کی دفعہ 8 کا جائزہ لیا گیا ہے، اور دفعہ 8(2) (اے) جس کا تعلق سود سے ہے اور دفعہ 8(2) (بی) جس کا تعلق مارک اَپ سے ہے، کو شریعتِ اسلام کے منافی قرار دیا گیا ہے، اس لئے جب کوڈ آف سوِل پروسیجر کی متعلقہ شقوں پر بحث کی جائے تو انہیں اس فیصلے میں دی گئی گائیڈلائن کے مطابق حل کرلیا جائے۔ ہم نے مذکورہ پیراگرافوں میں واضح کردیا ہے کہ قوانین اور اقتصادی و مالیاتی پالیسیاں مرتب کرنا عدالت کا نہیں بلکہ ریاست کے متعلقہ اداروں اور محکموں کا کام ہے، مگر کیونکہ حکومت نے اپنی درخواست میں اصرار کیا ہے کہ جن معاملات کو اُٹھایا گیا ہے ان کے سلسلے میں گائیڈلائن فراہم کی جائے اور ماہرینِ اقتصادیات، دینی اسکالرز وغیرہ نے بھی ان معاملات اور اسلام کے اقتصادی نظام کو کامیابی سے چلانے کے لئے درکار انفرااسٹرکچر کے بارے میں اپنی آراء کا اظہار کیا ہے، اب ہم بھی متعلقہ حلقوں کی توجہ کے لئے گائیڈلائن ریکارڈ کرتے ہیں۔ اسکالرز، ماہرینِ اقتصادیات، آڈیٹرز جن میں ڈاکٹر محمد عمر چھاپڑا، ڈاکٹر شاہد حسین صدیقی، مسٹر ابراہیم سیدات، سیّد محمد حسین، مسٹر اقبال خان اور مسٹر فہیم احمد جن کا تعلق وائٹل انفارمیشن سروسز (پرائیویٹ) لمیٹڈ سے ہے، نے اپنے دلائل میں متفقہ طور پر کہا کہ کسی بھی اقتصادی نظام کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے ایک مؤثر قانونی فریم ورک وضع کرنا ضروری ہوتا ہے، تاکہ اس کی مدد سے عذر، دھوکے اور فراڈ کا خاتمہ کیا جاسکے، یہ بھی کہا گیا کہ چھوٹے سرمایہ کار جو اسٹاک مارکیٹ میں سرمایہ کاری کرتے ہیں یا اپنی

رقوم بینک میں جمع کراتے ہیں انہیں نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ عذر کی موجودگی اور اسٹاک مارکیٹ میں مفروضوں کی بنیاد پر کاروبار کی وجہ سے ان کی جزوی یا مکمل رقم خردبُرد ہوجاتی ہے، اس مارکیٹ میں تقریباً 300 ارب روپے کی کمی واقع ہوگئی مگر کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں تھا، اس طرح بینک قرضوں میں تقریباً 300 ارب روپے کی نادہندگی کی وجہ سے یہ ادارے چھوٹے سرمایہ کاروں کے ڈیپازٹس پر معقول ریٹرن نہ دے سکے، ان دلائل میں یہ بھی کہا گیا کہ اقتصادی نظام میں کمزوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے نادہندہ افراد کسی مزاحمت کے بغیر بچ نکلتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ اسٹاک مارکیٹوں میں اندازوں اور مفروضوں کی بنیاد پر کاروبار کو روکنے کے لئے شفاف اور سخت اقدامات/قواعد وضع کئے جائیں، علاوہ ازیں ایک آزاد ادارہ مالیاتی پالیسی وضع کرے اور اسے چلائے اور اس مقصد کے لئے اسے تمام ضروری اختیارات تفویض کئے جائیں تاکہ وہ اپنی مرتب کردہ پالیسیوں پر صحیح معنوں میں عمل درآمد بھی کراسکے۔ یہی ادارہ آئین کے آرٹیکل 79 کے تحت ایسے قوانین اور قواعد بھی وضع کرے جو قرض حاصل کرنے والی سرگرمیوں پر محیط ہوں۔ مشہور مسلمان ماہرِ اقتصادیات ڈاکٹر محمد عمر چھاپڑا نے ایک معقول مدت کے اندر واجب الادا قرضوں کی وصولی پر بھی زور دیا، ان کے مطابق ایسے قوانین وضع کئے جائیں اور ان رقوم کی وصولی کے لئے ایسا طریقِ کار اختیار کیا جائے کہ اس کام کی تکمیل میں ایک مہینے سے زیادہ وقت نہ لگے۔ انہوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ اگر مالیاتی اداروں کے ڈیفالٹ کیسوں کو مہینوں اور سالوں تک لٹکایا جاتا رہا تو پھر اقتصادی سرگرمیوں کے لئے درکار فنڈز فراہم نہیں ہوسکیں گے اور پورا کا پورا سسٹم تباہ ہوکر رہ جائے گا۔ ان وجوہات کی بنا پر انہوں نے تجویز پیش کی کہ دھوکادہی کو ختم کرنے کے لئے ایسے اقدامات کرنا ناگزیر ہوں گے جو اسلامی بینکنگ سسٹم پر عمل درآمد کے دوران ممکنہ طور پر سامنے آسکتے ہیں۔ یہ اقدامات اقتصادی نظام کو مضبوط عملی بنیادوں پر استوار کرنے اور انہیں شفاف طریقے

سے چلانے کے لئے بھی ضروری ہوں گے۔ مسٹر فہیم احمد نے ان سخت قوانین اور ضوابط کا حوالہ دیا جو عذر، دھوکے اور فراڈ کی روک تھام کے لئے امریکہ میں اختیار کئے گئے ہیں، انہوں نے بتایا کہ امریکہ میں مالیاتی پالیسیوں کو ایک آزاد وفاقی ادارہ چلاتا ہے جو کسی ملک کے مرکزی بینک کی مانند ہے، مگر یہ اس قدر آزاد ہے کہ اس پر امریکہ کے صدر، کانگریس اور عدالتیں بھی اثر انداز نہیں ہوسکتیں۔ اس ادارے کا کام رقوم اور کریڈٹ کی فراہمی ہے، فریڈم آف انفارمیشن ایکٹ مجریہ 1966 امریکی حکومت سمیت تمام مالیاتی اداروں کو اپنے ریکارڈز دِکھانے کا پابند بناتا ہے، اس حق پر عدالتوں کے ذریعے عمل درآمد کرایا جاتا ہے، حکومت کے تمام ادارے تحریری درخواست پر اپنے ریکارڈز دِکھانے کے پابند ہوتے ہیں، البتہ اس میں 9 استثنائی صورتیں بھی ہیں جو ایکٹ کا حصہ ہیں۔ پرائیویسی ایکٹ مجریہ 1974 میں ان ریکارڈ کو تحفظ بھی فراہم کیا گیا ہے جو حکومت جمع کرتی ہے۔ امریکہ کا سیکورٹی ایکسچینج کمیشن پبلک اور نان پبلک ریکارڈز کو محفوظ رکھنے کا ذمہ دار ہے، اس میں رجسٹریشن اسٹیٹمنٹس کے علاوہ کمپنیوں اور افراد کی جانب سے فائل کی گئی رپورٹس شامل ہوتی ہیں۔ ٹریڈ اور کامرس کو صحیح خطوط پر چلانے اور ان سرگرمیوں میں سے فراڈ، دھوکا دہی اور غلط اطلاعات فراہم کرنے کے عمل کی بیخ کنی کرنے کے لئے بھی قوانین وضع کئے گئے ہیں، تجارت خصوصاً اندرونی تجارتی سرگرمیوں کے لئے کریڈٹ کے استعمال کو دُرست خطوط پر چلانے کے لئے بھی قانونی انتظامات کئے گئے ہیں۔ اندرون ملک کاروبار کرنے والے ایسے افراد اور ادارے جو 10 فیصد یا اس سے زائد منافع کماتے ہیں کو معلومات کے غلط استعمال سے روکنے کے لئے بعض صورتوں میں 6 مہینے کا منافع کارپوریشن ضبط کرلیتی ہے۔ امریکہ میں بیوروکریسی کے ارکان یعنی ایگزیکٹو برانچ کے ملازمین کے لئے 1978ء میں ضابطۂ اخلاق پر مبنی ایکٹ جاری کیا گیا تھا، اس کے علاوہ اخلاقیات کا سرکاری ادارہ اس ضمن میں قواعد وضوابط بھی جاری کرتا رہتا ہے، ان ضوابط میں واضح کیا گیا ہے کہ

پبلک سروس، پبلک ٹرسٹ کا مظہر ہوتی ہے، اس لئے ان ملازمین کے لئے ضروری ہے کہ وہ آئین، قوانین اور اخلاقی ضوابط کو اپنے ذاتی مفادات سے بالاتر رکھیں۔ وہ کوئی ایسا مالی فائدہ حاصل نہ کریں جو ان کی ڈیوٹی کے اخلاقی پہلو کو مجروح کرے، وہ جان بوجھ کر کوئی ایسا ناجائز وعدہ وعید نہیں کریں گے جس سے حکومت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، اور وہ اپنے منصب کو نجی مفادات کے لئے ہرگز استعمال نہیں کریں گے، اس طرح وہ اپنی سرکاری ڈیوٹی کے علاوہ کوئی ایسی ملازمت بھی نہیں کریں گے یا کسی ایسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیں گے جو ان کی سرکاری ذمہ داریوں سے متصادم ہو۔ ملازمین 20 ڈالر تک کا تحفہ بھی قبول نہیں کریں گے۔ امریکہ کے سینئر ملازمین کو ملازمت چھوڑنے کے بعد بھی بعض صورتوں میں ایک سال کے عرصے کے لئے اپنے سابقہ محکمے یا ادارے سے رابطہ کرنے تک کی اجازت نہیں ہوتی تاکہ انہیں کسی معاملے میں سرکاری اقدام پر اثرانداز ہونے یا کسی غیرملکی حکومت یا سیاسی جماعت کی مدد کرنے سے باز رکھا جاسکے۔ اس طرح سرکاری ملازمت چھوڑنے کے ایک سال بعد تک کوئی سینئر امریکی ملازم بیرون یا اندرونِ ملک ملازمت نہیں کرسکتا۔ اس طرح وضع کئے گئے اخلاقی ضوابط کی مدد سے ملکی مفادات اور دیگر ریاستی اُمور میں شفاف روش کو یقینی بنایا جاتا ہے، اس کے برعکس ہمارے ملک کے قوانین میں اس نوعیت کی فیئر ڈیلنگ، شفاف روش اور اخلاقی معیارات کا فقدان نظر آتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ سینئر افسر آئے دن ایک مقام سے دُوسرے مقام کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں، آج ایک افسر وفاقی ملازمت میں ہے تو کل وہ ورلڈ بینک یا آئی ایم ایف جیسے کسی بیرونی ادارے میں کام کر رہا ہوتا ہے، اور کبھی اس کے برعکس ہوتا دِکھائی دیتا ہے۔

لوگ ان افسروں کے مناصب میں تبدیلیوں کا خاموشی سے تماشا دیکھتے رہتے ہیں، اور وہ اپنے آپ سے یہ سوالات پوچھتے رہ جاتے ہیں کہ یہ ماہرین حقیقت میں کس کی سروس کرتے ہیں پاکستان کی یا بیرونی اداروں کی؟ ان موضوعات پر پاکستان

میں بھی قوانین تو موجود ہیں مگر انہیں جامع بنانے اور ان پر صحیح معنوں میں عمل درآمد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بات کی بھی صراحت کی جاتی ہے کہ بینکنگ سسٹم سے صرف رِبا کا خاتمہ مددگار ثابت ہونے کی بجائے نقصان دِہ ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف اہم اقتصادی شعبوں کا بڑے پیچیدہ انداز سے ایک دُوسرے پر انحصار ہے، اس لئے زیادہ مؤثر اور باحکمت راستہ یہ ہوگا کہ پہلے موجودہ اقتصادی شعبوں کو شریعتِ مطہرہ کے مقدس سائے میں لایا جائے اور اس میں اسے پھلنے پھولنے دیا جائے اور اس فضا میں اسے سود سے پاک نظام کا حصہ بنادیا جائے۔ ماہرین نے اپنے دلائل میں زور دیا کہ اس طریقِ کار سے معیشت بھی مضبوط ہوگی اور اس سے سود سے پاک معیشت کی بنیاد بھی استوار ہوگی۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی برآمد ہوگا کہ شہری اپنی بچتیں شریعت کی بنیاد پر استوار شعبوں میں لگائیں گے۔ یہ صورتِ حال خودبخود سود پر مبنی بینکاری نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل ہونے پر مجبور کردے گی۔ اس بات کی بھی وضاحت کی گئی کہ ہمارے بینکاری نظام میں شریعت کی بنیاد پر اسٹرونٹس کا طریقِ کار اس وجہ سے غیرترقی یافتہ ہے کہ ہمارے موجودہ اقتصادی شعبوں اور اسٹاک مارکیٹوں میں شرعی نظام رائج نہیں ہے۔ ماہرین نے مندرجہ ذیل چار شعبوں کی نشاندہی کی جو مغرب میں اقتصادی ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ (I) بینکنگ / مالیاتی شعبہ، (II) شیئر مارکیٹ، (III) قرض / بانڈ مارکیٹ، (IV) سرکاری لین دین۔ مذکورہ شعبوں میں ان عناصر کی اہمیت اور کارکردگی کو واضح کرنے کے لئے حسبِ ذیل اعداد وشمار کا حوالہ دیا گیا:

	امریکہ	ملائیشیا	پاکستان
جی ڈی پی	8ٹریلین	72بلین	60بلین
شیئر مارکیٹ	10ٹریلین	100بلین	6بلین
قرض مارکیٹ	10ٹریلین	22بلین	40بلین

یہ تمام اعداد وشمار اندازے کے مطابق ہیں اور ان کی مالیت امریکی ڈالر ہے۔ ان اعداد وشمار سے اہم ترین شعبوں میں پبلک کی شمولیت کا اظہار ہوتا ہے جس

نے ان ملکوں کی معیشت کے لئے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کی ہے اور جس کی بدولت عوام میں دولت کی بہتر انداز سے تقسیم ممکن ہوسکی ہے۔ یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اسلامی مالیاتی ماڈل کا ایک بنیادی عنصر ایک بڑی مڈل کلاس پیدا کرنا بھی ہے تاکہ دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہوکر نہ رہ جائے۔ اس کے علاوہ یہ چیز بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ کیپٹل مارکیٹ کی ٹوٹل ویلیو جی ڈی پی سے بہت بڑی ہے، اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اگر ہم پاکستان میں اسلامی بنیادوں پر معیشت کا ڈھانچہ استوار کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو ہم توقع کرسکتے ہیں کہ اس کی بدولت کی جانے والی اصلاحات سے ہر شعبے میں کرپشن کا خاتمہ ہوجائے گا، بینکنگ سیکٹر میں مقابلے کی فضا پروان چڑھے گی، غیرقانونی سرگرمیوں کی روک تھام کے لئے جو ضوابط تشکیل پائیں گے ان سے نمبرز اور فراڈ کی حوصلہ شکنی ہوگی، اور سرمایہ کاروں کو ہر سطح پر انصاف اور فیئر پلے مل سکے گا۔ یہ شفاف طریقِ کار اس قدر واضح ہے کہ اندازوں اور مفروضوں پر مبنی کاروباری سرگرمیاں کم از کم ہوجائیں گی، ان اعلیٰ مقاصد کو حسبِ ذیل اقدامات کے ذریعہ حاصل کیا جاسکے گا:

(1) انفرادی کریڈٹ کی تاریخ

کسی فرد کو اس وقت تک کوئی یوٹیلیٹی کنکشن، بینک اکاؤنٹ کھولنے کی اجازت یا قرض حاصل کرنے کی اجازت نہ دی جائے جب تک کریڈٹ بیورو اس امر کی رپورٹ فراہم نہ کردے کہ اس کا دامن ہر طرح کے واجبات سے صاف ہے، ایسے بیورو غیر سرکاری شعبے سے متعلق ہوں اور کوئی بھی تنظیم معمولی فیس ادا کرکے ان سے مطلوبہ معلومات حاصل کرسکے۔

(2) انڈسٹریز ریٹنگ

مندرجہ ذیل چار اداروں (I) اسٹینڈرڈ اینڈ پورز، (II) موڈیز، (III) ڈی سی آر اور (IV) فچ۔ آئی بی سی اے سے مالیاتی اور قرض دینے والے ادارے قرض مانگنے

والوں کی کریڈٹ ریٹنگ کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ امریکہ کا سیکورٹی ایکسچینج کمیشن ان اداروں کو لائسنس دیتا اور ان کے کام کے معیار پر نظر رکھتا ہے۔ پاکستان میں کریڈٹ ریٹنگ کے بزنس کو باقاعدہ بنانے کے لئے کریڈٹ ریٹنگ کمپنیز رولز مجریہ 1995ء وفاقی حکومت نے وضع کئے تھے، مگر ان کا مفید مقصد اطلاق نہیں کیا گیا، اس کے برعکس امریکہ میں افراد، کارپوریشنوں، بینکوں، مالیاتی اداروں اور میونسپلٹیوں کی ریٹنگ کریڈٹ کمپنیاں کرتی ہیں، سرمایہ کاران کی ریٹنگ پر اعتماد کرتے ہیں اور وہ ان کے بانڈز یا دیگر ترغیبات میں سرمایہ کاری کرنے سے پہلے ان کمپنیوں کی طرف سے جاری کردہ اعداد و شمار کو دیکھ لیتے ہیں۔ یہ ریٹنگ کمپنیاں ''معلومات حاصل کرنے کے حق'' کے فلسفے پر قائم کی جاتی ہیں۔ برطانیہ میں بھی ایسے قوانین موجود ہیں جو ضروری معلومات حاصل کرنے کی اجازت سے متعلق ہیں، فنانشل سروسز ایکٹ مجریہ 1986ء اور اس کے تحت وضع کئے گئے ضوابط سرمایہ کاروں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کے تحت مالیاتی اداروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ سیرس فراڈ آفس (ایس ایف او) کریمنل جسٹس سسٹم کے ایک جزو کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ ایس ایف او برطانیہ کی تاریخ میں چند بہت بڑے فراڈ کے کیسوں کی تحقیقات اور پراسیکیوشن کی ذمہ داریاں نبھا چکا ہے، ایس ایف او ایک آزاد سرکاری ادارہ ہے، جس کا سربراہ ایک ڈائریکٹر ہوتا ہے جو اٹارنی جنرل کی نگرانی میں اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتا ہے، وہ سرکاری محکموں کے علاوہ تجارت و صنعت کے محکمے، بینک آف انگلینڈ، انٹرنیشنل اسٹاک ایکسچینج، سیکوریٹیز اور سرمایہ کاری بورڈ وغیرہ کے ساتھ مربوط رہتا ہے، یہ اور دیگر تنظیمیں سنگین اور پیچیدہ جرائم، اختیارات کے ناجائز استعمال اور وائٹ کالر کرائم کے بارے میں ایس ایف او کو رپورٹ کرتی ہیں، ایس ایف او کا طریقِ تحقیقات بھی مختلف ہے۔ اس کی تحقیقاتی ٹیموں میں وکلاء، اکاؤنٹینٹ، پولیس افسر شامل ہوتے ہیں، جن کا تقرر ہر کیس کی

نوعیت کے مطابق کیا جاتا ہے۔ ان ٹیموں کے سربراہ کا ایک وکیل ہوتا ہے جو کیس کنٹرولر کا رول ادا کرتے ہوئے تحقیقات میں تیز رفتاری اور مؤثر پراسیکوشن کو یقینی بناتا ہے۔ ان اقدامات کے باعث مغرب نے عملی طور پر انصاف، فیئر پلے اور نمبرز کو کم از کم کرنے جیسی اسلامی تعلیمات کو اپنایا ہے۔ ہمیں بھی مناسب لیگل فریم ورک کے تحت ان اقدامات کو اپنانے کی ضرورت ہے تا کہ ہماری سوسائٹی کے تار و پود میں بھی شفاف روش آ سکے، معیشت جلد صحیح ڈگر پر گامزن ہو سکے اور اس طرح معاشرے میں بنیادی مثبت تبدیلیاں آ سکیں۔ ان ضروری ضوابط اور شفاف پن کے فقدان کی وجہ سے پاکستان کے سرمایہ کار تاج کمپنی اور کوآپریٹو سوسائٹیوں میں اپنے اربوں روپے ڈبو چکے ہیں۔ اسٹاک ایکسچینج میں آئے دن کمپنیاں بنتی رہتی ہیں، کارپوریٹ منیجروں کو اس بات کی کوئی پروا نہیں ہے ہ وہ سرمایہ کاروں کا اعتماد بحال کریں اور انہیں کمپنیوں کے حصص کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کریں، وہ سرمایہ کاروں کو منافع میں حصہ دینے کے بارے میں اپنی کوئی اخلاقی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے۔ یہ سب کچھ سخت ضوابط نہ ہونے، تھرڈ پارٹی ریٹنگ اور رسک پر کاروبار کرنے کی روش کے باعث ہو رہا ہے۔ کمپنیوں کی تعداد اور ان کے مالیاتی حجم کے بارے میں دُرست معلومات فراہم کر کے ضوابط کو مضبوط بنایا جا سکتا ہے اور ان طریقوں سے ڈھیلے ڈھالے قوانین کا سہارا لے کر سرمایہ کاروں اور کریڈیٹرز کو لوٹنے والے عناصر کی حوصلہ شکنی کی جا سکتی ہے۔ کراچی اسٹاک ایکسچینج میں کمپنیوں کی تعداد 750 ہے، جبکہ نیویارک اسٹاک ایکسچینج میں ان کمپنیوں کی تعداد اس سے پانچ گنا ہے، جبکہ امریکہ کی معیشت پاکستان کی معیشت سے 100 گنا بڑی ہے۔ مغربی ممالک کی طرح پاکستان میں Insider Trading کے لئے قوانین نہیں ہیں، حالانکہ مالکان اور بڑے شیئر ہولڈرز کا خود حصص کا کاروبار کرنا مغرب میں ایک جرم ہے۔ مغرب میں ڈوجونز (امریکہ)، ایف ٹی ایس سی (برطانیہ) اور نکی (جاپان) کے انڈیکس تھرڈ پارٹیاں مرتب کرتی ہیں، اس کے برعکس

کراچی اسٹاک ایکسچینج کا 100 انڈیکس اسٹاک مارکیٹ خود مرتب کرتی ہے، جس پر وزیر خزانہ نے بھی سخت نکتہ چینی کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ انڈیکس مارکیٹ کے چند بڑے کھلاڑیوں کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے مرتب کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے سادہ لوح سرمایہ کاروں کو مختلف ادوار میں اپنے خون پسینے کی کمائی سے محروم کردیا جاتا ہے۔ اس المناک صورتِ حال سے چھٹکارے کے لئے شفاف طریقِ کار رائج کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

(3) پاکستان میں قرض مارکیٹ

Debt-Market In Pakistan

ہمارے ہاں کی قرض مارکیٹ غیر متحرک ہے، اور اس کی بچتوں کا مغربی مارکیٹوں کے برعکس اسٹاکس کم ہونے کے دوران کئی مرتبہ صفایا ہو چکا ہے۔ قرض مارکیٹیں سرمایہ کاروں کو ضروری تحفظ فراہم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ چنانچہ اس غیر ترقی یافتہ قرض مارکیٹ کی وجہ سے بچتوں کا رُخ بنکوں کی طرف ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں رِبا کو فروغ ملتا ہے۔ دُوسری طرف صنعتوں کے لئے بھی طویل المیعاد فنانس درکار ہوتا ہے اس لئے وہ بھی بینکنگ سسٹم کا رُخ کرتی ہیں، نتیجتاً رِبا کے لین دین کی مزید ترقی ہوتی ہے، اگر مشارکہ سرٹیفکیٹس کے ذریعے اسلامی تعلیمات کے مطابق قرض کے نظریے کو اپنایا جائے تو ترقی یافتہ قرض مارکیٹوں کے توسط سے ایکویٹی/ فنڈز دستیاب ہو سکتے ہیں اور اس طریقے سے بینکوں پر انحصار کم ہو جائے گا۔ صوبوں، میونسپلٹیوں اور کارپوریٹ اداروں کو انفرااسٹرکچر فراہم کر کے انہیں فرد سرٹیفکیٹس جاری کرنے کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے جس سے لوکل فنڈز جنریٹ ہوں گے اور فارن ایکسچینج کے حصول پر انحصار مزید کم ہو جائے گا۔

(4) اعداد و شمار جمع کرنے والی فرموں کا قیام

مالیاتی اداروں کو چاہئے کہ وہ ماہرین، وکلاء اور دیگر متعلقہ افراد کی حوصلہ

افزائی کریں کہ وہ ان افراد اور کارپوریشنوں کے حسابات کے بارے میں معلومات جمع کریں جو نادہندگی کے عادی ہیں، تاکہ انہیں مجاز عدالتوں کو صحیح صحیح معلومات فراہم کرکے اور اس بات کی بھی نشاندہی کرکے کہ یہ اثاثے ان کے اپنے نام پر ہیں یا بے نام ہیں، ان سے ریکوری میں بڑی مدد دی جاسکتی ہے۔

(5) ریکوری سسٹم

غیرادا شدہ قرضوں سے متعلق قوانین کو منضبط کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی کافی تعداد میں مجاز عدالتوں کے قیام کی بھی ضرورت ہے، جن کے ججوں کی دیانت کسی شک وشبہے سے بالاتر ہو، ان ججوں کو بہت زیادہ کام نہ دیا جائے بلکہ انہیں اتنی تعداد میں مقدمات دیئے جائیں جن کے فیصلے وہ تین ماہ کے اندر کرسکیں، قرض لینے والے افراد اور کمپنیوں سے اس وقت ریکوریاں کرنے کا عمل شروع کرنے کا رُجحان عام ہے جب وہ اپنے اثاثوں کو ٹھکانے لگاچکے ہوتے ہیں، اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ریکوریوں کا سلسلہ اس وقت شروع کیا جائے جب قرض لینے والے ان سے متعلقہ اثاثے دسترس میں ہوں۔ اس صورت میں ایسے افراد کے خلاف مؤثر کاروائی بھی کی جاسکتی ہے اور ان کے اثاثوں کو بھی ہاتھ میں لے کر انصاف کے تقاضے پورے کئے جاسکتے ہیں۔

(6) افسروں اور اسٹاف کی تربیت

مالیاتی اداروں کے افسروں اور اسٹاف کو اسلامی معیشت کے بنیادی اُصولوں سے آگاہ کرنا نہایت ضروری ہے، انہیں اپنے اپنے شعبے کے بارے میں خاطرخواہ علم ہونا چاہئے تاکہ وہ اسلامی معیشت کے مطابق اختیار کئے جانے والے طریقوں سے روشناس ہوسکیں۔ تربیت دینے والے ادارے اپنے کورسز میں شرعی اُصولوں کے مطابق اکاؤنٹنگ اور آڈٹ کے طریقوں کو بھی شامل کریں، یہ تربیت بامقصد اور عملی تقاضوں پر پوری اُترنے والی ہونی چاہئے اور اس ضمن میں شرعی اہداف کو بہرصورت پیشِ نظر

رہنا چاہئے۔

(7) آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس

اسلامی تعلیمات اور شرعی تقاضوں سے ہم آہنگ آڈٹ اینڈ اکاؤنٹنگ سسٹم کو مرتب کرنا نہایت ضروری ہے، اکاؤنٹنگ اینڈ آڈیٹنگ آرگنائزیشن فار اسلامک انسٹی ٹیوشن پی او بکس نمبر 1176 منامہ بحرین نے ''اکاؤنٹنگ اینڈ آڈیٹنگ اسٹینڈرز فار اسلامک فنانشل انسٹی ٹیوشن'' کے نام سے ایک مفصل کتاب شائع کی ہے، جس میں شرعی تقاضوں کے مطابق پروسیجر وضع کئے گئے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرز اکاؤنٹنٹس اینڈ آڈیٹرز کو چاہئے کہ وہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان اور فنانس ڈویژن کی مدد سے ان اسٹینڈرز اور پروسیجرز کا بغور مطالعہ کرے اور جہاں کہیں ضرورت محسوس کرے ان میں ایسی ترامیم اور تبدیلیاں تجویز کرے جو پاکستان کے مالیاتی اداروں اور بینکوں کی ضروریات کو پورا کرسکیں۔ مختصر یہ کہ اس ضمن میں جن اقدامات اور جس قسم کا انفرااسٹرکچر اور لیگل فریم ورک وضع کرنے کی ضرورت ہے اس کا ایک مختصر سا خاکہ یہ ہوسکتا ہے:

(1) سرکاری مصارف میں زبردست کمی کرنے کی غرض سے سادگی اختیار کرنے کے سخت اقدامات کئے جائیں، خسارے کی سرمایہ کاری کو کنٹرول کیا جائے کیونکہ صرف ایسے اقدامات میں ہی اقتصادی بحالی کا حل مضمر ہے۔

(2) پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو چاہئے کہ وہ فیڈرل کنسالیڈیٹڈ فنڈ اور پبلک اکاؤنٹ، پراونشل کنسالیڈیٹڈ فنڈ اور پبلک اکاؤنٹ کو ریگولیٹ کرنے کے لئے ایک ایکٹ جاری کرے۔ یہ قانون قرض لینے، اس کے مقاصد و اسکوپ، اس کے استعمال، ریگولیشن، مانیٹرنگ اور دیگر متعلقہ اُمور پر نظر رکھنے کا فریضہ ادا کرے۔

(3) معیشت کے ہر شعبے میں شفاف پن لانے کے لئے قانون بنایا جائے۔ ایسے قوانین میں فریڈم آف انفارمیشن ایکٹ، پرائیویسی ایکٹ، امریکہ کے اخلاق

ضوابط اور برطانیہ کے فنانشل سروسز ایکٹ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

(4) وائٹ کالر اور اقتصادی جرائم کی روک تھام کے لئے سیریس فراڈ آفس (ایس ایف او) جیسا ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

(5) پبلک سیکٹر میں کریڈٹ ریٹنگ ایجنسیاں قائم کی جاسکتی ہیں۔

(6) فزیبلٹی رپورٹوں کا جائزہ لینے کے لئے بھی ایویلیوایشن کرنے والے ادارے قائم کئے جاسکتے ہیں۔

(7) اسٹیٹ بینک کے اندر حسبِ ذیل خصوصی محکمے قائم کئے جاسکتے ہیں:

(الف) اسلامی اقتصادیات کے کامیاب انتظام و انصرام کے لئے رہنمائی فراہم کرنے کی غرض سے شریعت بورڈ قائم کیا جائے۔

(ب) معلومات کے تبادلے، مالیاتی اداروں کے بارے میں منصوبوں کی فزیبلٹی رپورٹیں مرتب کرنے، ان کی جانچ پڑتال کرنے اور کریڈٹ ریٹنگ ادارے قائم کرنے کے لئے بھی ایک بورڈ قائم کیا جائے۔

(ج) مالیاتی اداروں/ بینکوں کو عملی طور پر فنی معاونت کی فراہمی کے لئے بھی ایک بورڈ قائم کیا جائے جو ان اداروں کو شرعی طریقوں کے مطابق کام کرنے کے دوران پیش آنے والی مشکلات کو دُور کرنے کے طریقوں کی طرف رہنمائی کرسکے۔ یہ بورڈ مالیاتی اداروں اور ان کے صارفین / گاہکوں کے درمیان بہتر تعلقات کے لئے بھی انتظامات تجویز کرسکے۔ یہ بورڈ اسلامک فنانشل سروس انسٹی ٹیوشن کی شکل اختیار کرسکتا ہے۔ ایسے ادارے حصص، سرمایہ کاری سرٹیفکیٹس اور مارکیٹوں میں سازگار ماحول پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ اپنی کارکردگی کی نوعیت کے اعتبار سے ایسے ادارے اسلامک بینکنگ کے لئے بھی بڑے مددگار ثابت ہوسکیں گے، جو عناصر ایسے ادارے کو وجود میں لانے میں بنیادی کردار ادا کریں گے ان میں ٹیکس کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے ترغیب دینے کے اقدامات بھی شامل ہوں گے، ماہرین

اقتصادیات کی نظر میں مذکورہ انفرااسٹرکچر کا قیام اسلامی بینکاری نظام کو کامیاب خطوط پر چلانے کے لئے ناگزیر ہے۔ کئی پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم نے معیشت کے نظام میں تبدیلی کے مختلف مراحل کے لئے مختلف تاریخیں مقرر کی ہیں، اس لئے ہم ہدایت کرتے ہیں کہ:

(1) وفاقی حکومت اس فیصلے کے اعلان کے ایک مہینے کے اندر اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں اعلیٰ سطح کا ایک کمیشن تشکیل دے جسے موجودہ مالیاتی نظام کو شرعی نظام میں تبدیل کرنے کے عمل کو عملی جامہ پہنانے، اس پر کنٹرول رکھنے اور نگرانی کرنے کے مکمل اختیارات حاصل ہوں۔ اس کمیشن میں علمائے شریعت، ماہرینِ اقتصادیات، بینکار اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس کو شامل کیا جائے۔

(2) یہ کمیشن اپنی تشکیل کے دو ماہ کے اندر معیشت کو اسلامی بنانے کے کمیشن اور راجہ ظفرالحق کمیشن کا جائزہ لینے اور اس پر عمل درآمد کے لئے ایک حکمتِ عملی وضع کرے گا، اس مقصد کے لئے پہلے وہ مذکورہ کمیشنوں کی رپورٹوں کو نمایاں بینکاروں، مذہبی اسکالرز، ماہرینِ اقتصادیات اور اسٹیٹ بینک و فنانس ڈویژن میں تقسیم کر کے انہیں ان پر رائے زنی کرنے اور تجاویز دینے کی دعوت دے گا۔ اس طریقِ کار کے تحت مرتب کی گئی حکمتِ عملی کو بعد ازاں قانون، خزانے اور تجارت کی وزارتوں، تمام بینکوں اور مالیاتی اداروں کے سپرد کر دیا جائے گا تاکہ وہ اس پر عمل درآمد کے لئے عملی اقدامات اُٹھائیں۔

(3) اس فیصلے کے اعلان کے ایک مہینے کے اندر قانون اور پارلیمانی اُمور کی وزارت اپنے حکام، اسلامی نظریاتی کونسل کے دو شرعی اسکالرز یا کمیشن فار اسلامائزیشن آف اکانومی کے دو شرعی اسکالرز پر مشتمل ایک ٹاسک فورس قائم کرے گی جو:

(الف) اُوپر دی گئی گائیڈ لائن میں تجویز کئے گئے قوانین کے مطابق امتناعِ رِبا کا نیا قانون وضع کرے گی۔

(ب) موجودہ مالیاتی اور دیگر قوانین کا جائزہ لے گی تاکہ انہیں نئے مالیاتی نظام سے ہم آہنگ کیا جاسکے۔

(ج) نئے مالیاتی انسٹرومنٹس کو قانونی تحفظ فراہم کرنے کے لئے بھی نئے قوانین مرتب کرے گی۔ اس ٹاسک فورس کی سفارشات کو "کمیشن فار ٹرانسفارمیشن" حتمی شکل دے گا جسے اسٹیٹ بینک میں قائم کرنے کی تجویز دی گئی ہے۔ اس کے بعد وفاقی حکومت ان قوانین کو جاری کردے گی۔

(4) اس فیصلے کے اعلان کے چھ مہینے کے اندر تمام بینک اور مالیاتی ادارے اپنی تمام سرگرمیوں سے متعلق معاہدوں اور دستاویزات کے نمونے تیار کرلیں گے اور انہیں اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں قائم کمیشن فار ٹرانسفارمیشن کے سامنے پیش کردیں گے جوان کا جائزہ لینے کے بعد ان کی منظوری دے گا۔

(5) وہ تمام جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں، میوچل فنڈز اور فرمیں، جن کا مجموعی سالانہ سرمایہ پچاس لاکھ روپے پر ہوگا، پر لازم ہوگا کہ وہ اپنی ریٹنگ کسی آزاد اور غیر جانب دار ادارے سے کرائیں۔

(6) تمام بینکوں اور مالیاتی اداروں پر لازم ہوگا کہ وہ نئے مالیاتی نظام سے اپنے افسروں، اسٹاف اور گاہکوں کو روشناس کرانے کے لئے تربیتی پروگرام اور سیمیناروں کا اہتمام کریں۔ اس فیصلے کے اعلان کے ایک مہینے کے اندر وزارتِ خزانہ ماہرین پر مشتمل ایک ٹاسک فورس بنائے گی جو اندرونِ ملک قرضہ جات کو منصوبہ جاتی سرمایہ کاری میں تبدیل کرنے کے طریقوں کا جائزہ لے گی اور ایک میوچل فنڈ قائم کرے گی جو اسی بنیاد پر حکومت کو سرمایہ فراہم کرے گا، اس میوچل فنڈ کے یونٹ عام لوگ خرید سکیں گے اور ان کی حقیقی قدر کی بنیاد پر ان کی ملحقہ مارکیٹوں میں خرید و فروخت کی جاسکے گی۔ موجودہ سرمایہ کاری سیونگ اسکیموں کے تحت جاری کردہ موجودہ بانڈز کے سرٹیفکیٹوں کو بھی جو سود پر مبنی ہیں مجوزہ میوچل فنڈ کے یونٹوں میں تبدیل

کر دیا جائے گا۔

(8) اندرونِ ملک بین الحکومتی قرضہ جات اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان سے وفاقی حکومت کے قرضوں کو سود سے پاک بنیادوں پر وضع کیا جائے گا۔

(9) وفاقی حکومت پر لازم ہوگا کہ وہ غیرملکی قرضوں سے جلد از جلد سبکدوش ہونے کے لئے سنجیدہ کوششیں بروئے کار لائے، اگر ضروری ہو تو مستقبل میں قرضوں کے حصول کو اسلامی طرزِ سرمایہ کاری کے مطابق مرتب کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی جائے۔

(10) حسبِ ذیل قوانین کو تعلیماتِ اسلامی کے منافی قرار دیا گیا ہے، اس لئے 31 مارچ 2000ء سے انہیں کالعدم قرار دیا جا رہا ہے:

(1) انٹرسٹ ایکٹ 1938ء۔

(2) ویسٹ پاکستان منی لینڈرز آرڈیننس مجریہ 1960ء۔

(3) ویسٹ پاکستان منی لینڈرز رولز مجریہ 1965ء۔

(4) پنجاب منی لینڈرز آرڈیننس مجریہ 1960ء۔

(5) سندھ منی لینڈرز آرڈیننس مجریہ 1960ء۔

(6) این ڈبلیو ایف پی منی لینڈرز آرڈیننس مجریہ 1960ء۔

(7) بلوچستان منی لینڈرز آرڈیننس مجریہ 1960ء۔

(8) بینکنگ کمپنیز آرڈیننس مجریہ 1962ء کی سیکشن 9۔

(11) دیگر وہ قوانین یا ان کی دفعات جنہیں تعلیماتِ اسلامی کے منافی قرار دیا گیا ہے بھی 30 جون 2001ء سے کالعدم تصور کئے جائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی اپیلوں کو نمٹایا جاتا ہے۔

(فاضل ججوں کے دستخط)